قد تبین الرشد من الغی

طلوعِ اسلام

بیادگار علامہ اقبالؒ

سالانہ عہ

فی پرچہ عہ

بیرونِ ملک سے

سالانہ ۱۵ عہ

فی پرچہ عہ

ادارہ طلوعِ اسلام رابسن روڈ کراچی

صحیح انتخاب اس وقت ہو سکتا ہے

جب آپ کے سامنے انتخاب کے لئے قسم قسم کا مال موجود ہو۔ اور

خریداری کا فیصلہ

اس وقت ہو سکتا ہے جب آپ تسلی کر لیں کہ قیمت واجبی ہے اور

آپ کا اطمینان

اس وقت ہو سکتا ہے جب آپ خرید کردہ مال کے استعمال کے بعد دیکھ لیں کہ جیسا کہا گیا تھا مال ویسا ہی نکلا

آپ یونہی پریشان نہ ہو جیئے

ہمارے ہاں آیئے اور دیکھیے کہ مذکورہ بالا شرائط کے مطابق آپ کا اطمینان ہوتا ہے یا نہیں

ہمارے ہاں —— ہر قسم کا ہوزری کا سامان۔ ٹائیلٹ کے لوازمات۔ اون۔ گرم کپڑا۔ ٹیلرنگ

(صرف جنس کیلئے) تحفہ جات۔ اور دیگر متفرق اشیائے ضروریات کا بہت بڑا اسٹاک موجود رہتا ہے۔

تھوک کے لئے :	سمرسیٹ سٹریٹ، کراچی
اور پرچون کیلئے :	الفنسٹن سٹریٹ، کراچی

تشریف لایئے

نیز ہم ہوزری کا نہایت اعلیٰ مال خود تیار کرتے ہیں۔

کوہ نور نٹنگ ملز، کلیٹن روڈ۔ کراچی

ہماری صناعی کا مرکز ہے۔ نفاست اور پائیداری میں بہت کم ملز اس کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔

نیاز اگین :- ایچ غلام محمد اینڈ برادرز۔ کراچی

آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰ است

از دمِ سیرابِ آں اُمّی لقب — لالہ رُست از ریگِ صحرائے عرب

اُو دلے در پیکرِ آدم نہاد — اُو نقاب از طلعتِ آدم کشاد

در جہاں آئینِ نو آغاز کرد — مسندِ اقوامِ پیشیں در نورد

ہر خُداوندِ کہن را اُو شکست — ہر کہن شاخ از نمِ اُو غنچہ بست

عقل را اُو صاحبِ اسرار کرد — عشق را اُو تیغِ جوہر دار کرد

از کلیدِ دیں درِ دُنیا کُشاد — ہمچو اُو بطنِ اُمِ گیتی نزاد

دینِ اُو آئینِ اُو تفسیرِ کُل
درجبینِ اُو خطِ تقدیرِ کُل

ای سوار اشهب دوران بیا

خیز و قانون اخوت ساز دہ
جام صہبای محبت باز دہ

باز در عالم بیار ایام صلح
جنگجویان را بدہ پیغام صلح

شورش اقوام را خاموش کن
نغمۂ خود را بہشت گوش کن

باز این اوراق را شیرازہ کن
باز آئین محبت تازہ کن

رہروان را منزل تسلیم بخش
قوت ایمان ابراہیم بخش

نوع انسان مزرع و تو حاصلی
کاروان زندگی را منزلی

سجدہ ہای طفلک و برنا و پیر
از جبین شرمسار ما بگیر!!!

طلوعِ اسلام اپنی نشأۃ ثانیہ کے

تیسرے سال کا آغاز

دس لاکھ مقتولین کے خونِ ناحق کے تصور سے کرتا ہے جنہیں مشرقی پنجاب، دہلی، یو۔پی اور ملحقہ ریاستوں میں تقسیم ہند کے عواقب میں مسلح اور منظم ہندوؤں اور سکھوں نے نہایت بیدردی سے ذبح کر دیا۔ محض اس جرم میں کہ قالوا ربنا اللہ ان کے خونِ گراں بہا کا ایک ایک قطرہ ہماری طرف اٹھ اٹھ کر دیکھ رہا ہے کہ ہم اس کی قیمت کس طرح وصول کرتے ہیں!

ہزارہا بیکس و مظلوم، عصمت مآب خواتین کی یاد سے کرتا ہے جو وحشی سکھوں کے پنجۂ فولادی میں جکڑی گئیں اور جو آج تک ان درندوں کے بھٹ میں اس طرح آتشِ خاموش کی طرح جل رہی ہیں کہ ان کی آہ بھی ہم تک نہیں پہنچ سکتی۔ ان کی بےبسی اور بیچارگی، ہماری غیرتِ قومی اور حمیتِ ملّی کا ماتم کر رہی ہے کہ ہائے آخر ہمارے شرم و حیا کے احساسات کہاں غارت ہو گئے!

ان کروڑوں ستم رسیدہ فرزندانِ ملتِ اسلامیہ کی بےکسی کے احساس سے کرتا ہے جو ہندوستان اور کشمیر میں تنگ نظر اور کینہ پرور ہندوؤں کے جذبۂ انتقامِ ناحق کا بری طرح شکار ہو رہے ہیں اور جن کی خاموش نگاہیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ ربنا اخرجنا من ھذہ القریۃ الظالم اھلھا (اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس ملک سے نکال لے جس کے رہنے والے اس قدر ظالم واقع ہوئے ہیں)

ان تمام مظلوم و مقہور

گرفتارانِ پنجۂ بیداد کی بےکسی اور بےبسی کا علاج صرف اس میں ہے کہ پاکستان کو اس قدر مضبوط اور طاقتور بنا دیا جائے کہ اس کے رعب سے ہر مخالف کے سینے میں کپکپی پیدا ہو جائے۔ بس یہ کام ہمارے کرنے کا ہے۔ باقی سب کچھ خود بخود ہو جائے گا۔

وان تنصروا اللہ ینصرکم

استعمارِ فرنگ

کی ہر وہ کڑی جو دنیا کے کسی حصہ میں ٹوٹ کر گرتی ہے اس کا اعلان کرتی ہے کہ انسانیت کے دبائے ہوئے گلے کی ایک اور رگ آزاد ہو گئی تاکہ یہ فطرت کی کھلی فضا میں سانس لے سکے۔

انڈونیشیا

کے سینے سے ولندیزی کابوس کا اتر جانا ہر حریت پسند انسان کے لیے بہجت و مسرت کی نشید کا ترانہ ہے۔ ہم سرزمین انڈونیشیا میں بسنے والے خوش بخت انسانوں تک اپنا اولین ہدیۂ تبریک و تہنیت پہنچانے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ اس عمومی تہنیت کے بعد ہم

اپنے ان بھائیوں سے

یہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ایک مسلمان کے نزدیک حقیقی آزادی صرف اس وقت نصیب ہو سکتی ہے جب ان کے ملک میں خدا کا قانون رائج ہو جائے۔ آج دنیائے اسلام کی آنکھیں پاکستان اور انڈونیشیا کی طرف لگ رہی ہیں۔ اس لئے کہ یہاں ملوکیت کی لعنت نہیں، لہٰذا یہاں اسلامی نظام کی تنفیذ کے امکانات بہت قوی ہیں۔ ذرا سوچئے کہ اگر مسلمانوں کی یہ دو وسیع مملکتیں صحیح قرآنی نظام کو قائم کرلیں تو یہاں سے لیکر بحیرۂ روم اور مراکو تک کے علاقوں میں کتنا بڑا انقلاب واقع ہو جائے۔ وہ انقلاب جو ساری نوعِ انسانی کے لئے ایک نئی زندگی کا پیغام اپنی آغوش میں رکھتا ہے۔ ہم پاکستان اور انڈونیشیا کے طالعمند مسلمانوں سے صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ

دنیا کی امامت تمہارا انتظار کر رہی ہے

دیر تمہاری طرف سے ہے ایسے مساعد حالات بہت کم مواقع پر پیدا ہوا کرتے ہیں۔

بیا ایں خاک داں را گلستاں ساز
جہانِ پیر را دیگر جواں ساز

پاکستان کا نیا کلچر

انگریز ہندوستان میں اپنے عہد حکومت میں، اپنے پیغمبر نہیں بلکہ "خدا کے بیٹے" اس سے بھی آگے "خود خدا" کا یوم پیدائش اور اپنے سال کا نوروز، مئے و پیالہ کی رنگینیوں اور رقص و سرود کی سرمستیوں سے منایا کرتا تھا۔ فرنگی کا تسلط یہاں سے اڑھائی برس ہوئے نکل گیا لیکن فرنگیت کی لکیریں یہاں کس گہرائی سے چھوڑ گیا ہے اس کا اندازہ، شراب و شباب کی اس محفل خمار آگیں سے لگائیے جو سال نو کی آمد کی خوشی میں، کراچی کے ایک بہت بڑے کلب میں، ۳۱ دسمبر اور یکم جنوری کی درمیانی شب کو انتہائی مستیوں اور رنگینیوں میں ڈوب کر منائی گئی۔ ایک دیدہ ور تماشائی کے بیان کے مطابق عمال حکومت پاکستان کی اکثر بیگمات شفق ساماں اور دختران برق داماں مغربی نیم عریاں لباس میں ساق و سینہ کی نمائش رہا جلوہ پاشیوں کے ساتھ اس محفل رنگ و تعطر میں غارت گر تمکین و ہوش بن رہی تھیں۔ ان کا کہنا ہے کہ عشائیہ (Supper) کے بعد میں نے پینے کے لئے پانی مانگا تو بیرہ نے ایک معنی خیز تبسم کے ساتھ میری طرف دیکھا جو کھلے الفاظ میں کہہ رہا تھا کہ یہ اگلے وقتوں کی کوئی بوسیدہ روح یہاں کیا کرنے آگئی! اس نے کہا کہ حضور! یہاں

شاہد و شمع و شراب و شکر و ناؤ سرور

میں پانی کا کیا کام؟ آج رات، یہاں پانی کے نلوں سے شراب بہہ رہی ہے۔ اس کے بعد محفل رقص شروع ہوئی حسن و عشق کے اس امتزاج متحرک میں جسے دیکھئے

ہمہ اعضا چو موج بادہ در جوش

ٹھیک بارہ بجے، تمام بتیاں بجھا دی گئیں۔ اس اندھیرے میں کیا کچھ ہوا۔ آنکھوں نے تو دیکھا نہیں البتہ کان اس کی غمازی ضرور کر سکتے ہیں۔ انگریز کے آئین فحاشی کے مطابق اس اندھیرے میں ہر عورت کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ جسے چاہے چوم لے۔ ہمارے راوی کا بیان ہے کہ ایک گوشے سے ایک ساغر شکن "چٹاہٹ" کے ساتھ کسی مرد کی گھبرائی ہوئی سی آواز آئی کہ۔

ارے یہ کیا ــــ؟

اس کے جواب میں، قہقہہ کی بلوریں کھنک سے فضا مرتعش ہو گئی اور ایک شوخ و شنگ آواز نے کہا۔

پیپلز پاکستان کا نیا کلچر

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوع اسلام

کراچی

بدل اشتراک	اس پرچہ کی قیمت	مرتّب
سالانہ — دس روپے ششماہی — چھ روپے	ایک روپیہ آٹھ آنے	محمد یونس

نمبر ۱، ۲	جنوری، فروری سنہ ۱۹۵۰ء	جلد ۳

فہرست مضامین

افتتاحیہ سالِ نو	۱	بابُ المراسلات (۱۔ انتخابات ۲۔ اقتصادی کانفرنس ۳۔ آیۂ رجم)	۵۹ - ۶۴
انڈونیشیا	۲	تدریجی نبوت	۶۵ - ۷۱
استعمارِ فرنگ / پاکستان کا نیا کلچر	۳	آہ! مولانا شبیر احمد عثمانی۔ (نظم) (اسد ملتانی)	۷۲
لمعات	۵		
معراج انسانیت (محترم پرویز صاحب)	۹ - ۳۰	اسبابِ زوالِ امت (محترم پرویز صاحب)	۷۳ - ۱۲۴
نقد و نظر	۳۳ - ۴۰		
۱۹۴۹	۴۱ - ۵۸	کچھ اپنے متعلق	۱۲۵ - ۱۲۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

نفسِ انسانی کی حیلہ جوئیاں اور فریب کاریاں بعض اوقات ایسے لطیف پردوں میں مستور ہوتی ہیں کہ ان کی حقیقت بمشکل بھانپی جا سکتی ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد، آئینِ اسلامی کے نفاذ کا مطالبہ شروع ہوا۔ اس مطالبہ کی صداقت میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔ پاکستان کے وجود کا جواز اسی حقیقتِ کبریٰ میں مضمر ہے۔ لیکن ذرا غور کیجیے کہ نفسِ انسانی کی سہل انگاریوں نے اس سے کیا فائدہ اٹھایا؟ اس نے نہایت معصومیت سے یہ فریب دے رکھا ہے کہ تمام انفرادی حقوق اور فرائض آئینِ اسلامی کے نفاذ تک ملتوی ہو چکے ہیں۔ اصلاحِ عمل اور تطہیرِ فکر کی سب کاوشیں سردِ خانے میں پڑ چکی ہیں۔ معاشرہ کی تمام برائیاں کھلے بندوں عمل میں لائی جا سکتی ہیں۔ ہر قسم کے ذمائمِ اخلاق اور خباثتِ معاملات تا بہ نفاذِ آئینِ اسلامی روا رکھے جا سکتے ہیں۔ اب ہر شخص کو کھلی چھٹی ہے کہ وہ جھوٹ بولے، دھوکا دے، فریب کرے۔ دغا بازی سے سب کچھ کمائے۔ اگر وہ اپنے آپ کو مروجہ قانون کی گرفت سے بچا سکتا ہے تو اس کے بعد دنیا کے معاملات میں اس کے لئے سب کچھ جائز اور شیرِ مادر کی طرح حلال ہے۔ آپ صبح سے شام تک مختلف لوگوں سے معاملہ کیجیے اور پھر رات کو، کچھ دیر پہلے نیند سے، دن بھر کے معاملات پر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ کتنے لوگ ہیں جو معاملہ کے صاف اور بات کے سچے ملتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ۹۹ فیصدی معاملات میں آپ دھوکہ دہی اور غلط بیانی کے شکار ہوئے ہوں گے یہ چیزیں ہمارے معاشرہ میں اس قدر عام ہو چکی ہیں کہ زندگی کے کسی شعبے اور معاملات کے کسی گوشے میں آپ کو یہ اطمینان نہیں ہو سکے گا کہ جس سے آپ بات کر رہے ہیں اس کے دل میں وہی ہے جو اس کی زبان پر ہے۔ اور جس سے آپ کچھ معاملہ کر رہے ہیں اس میں آپ کو وہی کچھ مل رہا ہے جو آپ کو بتایا گیا ہے۔ آپ عدالتوں کے احاطہ میں پھر رہے ہوں یا دفاتر کے کمروں اور برآمدوں میں۔ خوانچہ والوں سے بات کر رہے ہوں، یا کسی بہت بڑی کاروباری فرم سے۔ دوستوں کی محفل میں کسی پروگرام کی تفاصیل طے کر رہے ہوں یا خود اپنے گھر کے ملازمین یا دیگر کاروباری متعلقین سے حساب

چکا ہے ہوں۔ غرضیکہ آپ کہیں بھی ہوں اور کسی سے کوئی بھی معاملہ کر رہے ہوں آپ کو کبھی اطمینان نہیں ہو سکتا کہ آپ کو دھوکا نہیں دیا جا رہا۔ اور یہ سب کچھ اس معاشرہ میں ہو رہا ہے جہاں متحدہ اور متفقہ مطالبہ یہ ہے کہ پاکستان میں اسلامی آئین کا نفاذ ہونا چاہیئے۔ جب ان سے پوچھیئے کہ اس آئین کے بعد کیا ہو گا تو ہر شخص بلا توقف و تامل کہہ دے گا کہ اسلامی نظام میں کوئی جھوٹ نہیں بولیگا کوئی کسی دوسرے کو فریب نہیں دے گا۔ کسی کا مال بطریق حرام نہیں کھائے گا کہیں ظلم نہیں ہو گا، زیادتی نہیں ہو گی۔ یعنی انہوں نے سمجھ رکھا ہے کہ آج شام کو اسلامی نظام کا قانون پاکستان کی دستوریہ سے پاس کیا اور دوسری صبح آپ دیکھیں گے کہ سارے پاکستان میں کوئی جھوٹا، بد دیانت، بد معاملہ انسان باقی نہیں رہے گا۔ ادھر یہ قانون پاس ہوا ادھر سب کے سب سچے اور پکے مومن بن گئے۔ اس لئے ساری دیر اس قانون کے پاس ہونے کی ہے۔ غور فرمایئے! کس قدر پر فریب ہے یہ حیلہ اور کیسی مضحکہ خیز ہے یہ روش۔ اس میں چھوٹے اور بڑے سب شامل ہیں۔ نہ اس قانون کے نافذ کرنے کے مدعیوں نے اپنی روش میں کوئی تبدیلی پیدا کی ہے۔ نہ انہوں نے اپنی حالت سنوارنے کی کوئی فکر کی ہے جن پر یہ قانون نافذ کیا جائے گا۔ پوری کی پوری قوم بدن بدن بد معاملگی میں ڈوبتی چلی جا رہی ہے اور اس کا سارا الزام قانونِ اسلامی کے پاس نہ ہونے کے سر دھرا جا رہا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صحیح نظام ان اجتماعی مفاسد کی اصلاح کر دیتا ہے جن کی درستگی افراد کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ معاملات کی دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس میں افراد اپنی اصلاح حال کر سکیں۔ مثلاً آپ زندگی کے اس گوشے کو لیجیئے جہاں روزمرہ کی ضروریاتِ زندگی کے لئے ہمیں باہمی معاملہ کرنا پڑتا ہے۔ یعنی دوکاندار اور گاہک کا معاملہ۔ آپ دیکھیئے کہ صبح سے شام تک آپ کو کتنے دوکانداروں سے واسطہ پڑتا ہے، اور ان میں سے کتنے ہیں جو دھوکا نہیں دیتے۔ نرخ میں دھوکا، ماپ تول میں دھوکا۔ چیز کے اصلی اور نقلی ہونے میں دھوکا۔ خالص اور ملاوٹ میں دھوکا۔ چنانچہ آج خرید و فروخت کی دنیا میں دھوکا معمول ہو گیا ہے اور دیانت استثناء۔ آپ جتنی احتیاط چاہے برت لیجیئے، کبھی یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ آپ نے دھوکا نہیں کھایا۔ نتیجہ یہ کہ معاشرہ میں باہمی اعتماد ختم ہو گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اطمینان رخصت۔ جس قوم کو بداعتمادی اور بے اطمینانی کے اس جہنم میں زندگی بسر کرنی پڑے اس کی عمومی اصلاح اور اجتماعی فلاح کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ معاشرہ کے اس کلی بگاڑ میں اگر کسی طرف سے یہ آواز آجاتی ہے کہ وہاں معاملہ کی صفائی، نیت میں حسن اور بیع و شری میں دیانت کا امکان ہے تو طبیعت خود بخود ادھر جھک جاتی ہے۔ اور اس امکان ہی سے روح میں ایک سکون اور قلب میں انبساطی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ (حالانکہ یہ وہ چیز ہے جسے مسلمانوں کے معاشرہ کا معمول ہونا چاہیئے تھا۔) چنانچہ یہی ہے انشراح

وانبساط کی وہ کیفیت جو اس خبر سے پیدا ہوئی کہ لاہور کے شیر فروشوں کی برادری نے حلفیہ اعلان کیا ہے کہ وہ ہمیشہ خالص دودھ بیچا کریں گے۔ ہم اس برادری کے افراد کو ان کے اس عزم پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے متوقع ہیں کہ وہ اپنے اس اعلان پر کاربند رہیں گے اور اس طرح بیع وشریٰ کی دنیا میں کم از کم ایک گوشہ تو ایسا پیدا کر دیں گے جہاں انسان کو اتنا اطمینان ہو کہ مجھ سے دھوکہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر شیر فروشوں کی اس برادری نے اپنے اس فیصلہ میں استقامت برتی تو ہمیں امید ہے کہ اس کے بعد، باہمی لین دین کے اور شعبے بھی ان کی تقلید کریں گے اور اس طرح ان کی یہ اولیت ایک نہایت مستحسن انقلاب کی بنیاد بن جائے گی۔

اے کاش! ہمارے اوپر کے طبقہ میں بھی کہیں اس کا احساس پیدا ہو جائے کہ ان کے بیع وشریٰ کے معاملات میں بھی دیانت ضروری ہے۔ اگر ان غریب گھوسیوں کی طرح ہمارے ارباب ثروت واقتدار بھی دودھ اور پانی کو الگ الگ رکھنے کا عہد کر لیں تو قوم کی کایا پلٹ جائے۔ لیکن جو دوکاندار پیکنگ اور لیبل کے زور پر سودا بیچنے کا عادی ہو جائے۔ انہیں خالص مال دینے میں خسارہ ہی خسارہ نظر آیا کرتا ہے۔ انہیں کون سمجھائے کہ یہ نگاہ کا پھیر ہے۔ وہی سودا درحقیقت نفع رساں ہے جس میں مال خالص لگایا جائے۔ واما ینفع الناس فیمکث فی الارض۔ زمین میں بقا اسی کے حصہ میں آسکتی ہے جو نوع انسانی کے لئے نفع رساں ہو۔

اشاعت زیر نظر میں محترم پرویز صاحب کا موعودہ مقالہ "اسباب زوال اُمّت" شائع ہو رہا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ محترم پرویز صاحب کا یہ مضمون نگہ بصیرت کے سامنے حقائق ومعارف کی نئی نئی راہیں کھول دیتا ہے۔ لیکن اپنے اس مقالہ میں انہوں نے جن گہرائیوں تک پہنچ کر حقائق کا مطالعہ کیا ہے اور اپنے نتائج فکر کو جس حسن اسلوب سے پیش کیا ہے اس کی نظیر مشکل سے مل سکے گی۔ یہ مقالہ بڑے گہرے غور وفکر کا محتاج ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں "دین اور مذہب" سے متعلق اتنے متنوع گوشے سامنے آگئے ہیں کہ ان میں سے ہر گوشہ ایک مستقل تصنیف کا حامل ہے۔ ارباب طلوع اسلام سے توقع ہے کہ وہ اس گرانبہا مقالہ کا نہایت غور وفکر سے مطالعہ کریں گے کیونکہ (اس قسم کے ٹھوس حقائق گہرے تدبر ہی سے سمجھ میں آیا کرتے ہیں، بالخصوص جبکہ وہ ایسی باتیں پیش کریں جو عام پامال اور فرسودہ راہوں سے ہٹ کر بیان کی گئی ہوں۔ طلوع اسلام اپنی اس سعادت پر جس قدر بھی ناز کرے کم ہے کہ اس قسم کے حقیقت کشا مقالات کی اشاعت کا شرف اس کے حصہ میں آرہا ہے۔

قارئین طلوع اسلام کو نئے سال کا تحفہ معراج انسانیت مبارک ہو۔ باقی رہے جناب

معتقد۔ تو ان کی خدمت میں اس سے زیادہ اور کیا عرض کیا جائے کہ

جان تم پر نثار کرتے ہیں
ہم نہیں جانتے دعا کیا ہے؟

کچھ نئی کتابیں

خالد بن ولید	از امیر احمد	۴/-
حیات نبی	عبد العلی خاں	۱/۸
دو قرآن	پروفیسر برق	۳/۸
حیات قائد اعظم	سوار احمد خاں	۶/۸
مہاجر	مضطر ہاشمی	۳/۸
رود کوثر	محمد اکرم	۵/-
معراج انسانیت	علامہ پرویز	۲۰/-
تاریخ انقلابات عالم	بزمی	۱۰/-

(نوٹ) علامہ اقبالؒ کی تصانیف کے نئے ایڈیشن

جوش کی نادر کتابیں

سنبل و سلاسل	۴/۸
حرف و حکایت	۳/-
فکر و نشاط	۲/۸
بحر المحبت	۱/-
نقش و نگار	۳/۸
روح ادب	۲/-
آیات و نغمات	۳/۸
شعلہ و شبنم	۶/-
جنون و حکمت	۳/-

ملنے کا پتہ:۔ عارف پبلشنگ ہاؤس۔ رابسن روڈ کراچی

کتاب لمیٹڈ کراچی

آپ کا مستقبل اسی حالت میں تسلی بخش ہو سکتا ہے جبکہ آپ کو اقتصادی طور پر اطمینان ہو۔ آپ ملازم پیشہ ہیں یا ملازمت کی زندگی گذار کر پنشن یافتہ ہیں، بہرحال آپ کی آمدنی کا ذریعہ محدود ہے۔ مستقبل کی فکر دامنگیر ہے۔ آیئے ہم آپ کو اس فکر سے نجات دلائیں۔

آپ کم از کم ایک حصہ خرید لیں۔ ہمارا یہ ادارہ ہر سال بچت کا تمام روپیہ حصہ داروں پر برابر برابر تقسیم کردیگا۔ اس صورت میں چند ہی سالوں میں آپ کے حصہ میں اس قدر روپیہ آجائیگا کہ آپ نہایت اطمینان سے الگ کاروبار کر سکیں گے۔ آپ اور آپ کی اولاد خوشحالی کی زندگی بسر کر سکے گی۔ کاروبار کے لئے حکومت کی طرف سے ایک لاکھ روپیہ منظور ہوا ہے ایک حصہ کی قیمت ایک ہزار روپیہ ہے جو قسطوں میں بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ شروع سال ہی میں کاروبار میں شریک ہوجائیں تو پورے منافع میں برابر کے حقدار ہوجائیں گے۔ ضروری کاغذات منگوانے کیلئے صرف دو روپیہ بھیجدیں۔

المشتہر

(جے۔ بی۔ عارف) منیجنگ ڈائریکٹر
کتاب لمیٹڈ۔ رابسن روڈ۔ کراچی

معراجِ انسانیت

پرویز

اس ماہ سے طلوعِ اسلام کی زندگی کا تیسرا سال شروع ہوتا ہے۔ طلوعِ اسلام کی زندگی کا جو مقصد ہے اس کے پیشِ نظر حسنِ اتفاق باعثِ سعادت ہے کہ اس سال کا آغاز ربیع الاول سے ہو رہا ہے۔ یہ تاریخی مہینہ حیاتِ انسانی میں غیر معمولی اہمیت و عظمت کا حامل ہے۔ اسی مہینہ میں اس آفتابِ جہانتاب کا طلوع ہوا جس نے افقِ رسالت سے ابھر کر انسانیت کی شبِ تاریک کو نورِ سحر سے آئینہ پوش بنا دیا۔ یہ بھی حسنِ اتفاق ہے کہ جناب پرویز کی معرکۃ الآرا کتاب "معراجِ انسانیت" جو تذکارِ جلیلہ ہے اس حیاتِ اطہر و اقدس کا، جس کا ظہورِ آدم کا ہنگامِ نمود ثابت ہوا، انہی دنوں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی۔ طلوعِ اسلام کے لئے اِن اتفاقاتِ حسن بہاریں سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے احساسات و ابتہاجات میں قارئینِ کرام کو بھی شریک کرے۔ چنانچہ ذیل میں "معراجِ انسانیت" کے دو ابواب معنون بہ "صبحِ بہار" اور "جہانِ نو" پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ اقتباسات ذاتِ رسالتمآب کا تذکارِ جلیلہ بھی ہیں اور معارف القرآن کی جلد چہارم کا تعارف بھی۔

طلوعِ اسلام

صبحِ بہار

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی   جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی

جب زمین گرمی کی شدت سے تپنا لگتی ہے، تمازتِ آفتاب اس کی رگ رگ سے نمِ زندگی چوس لیتی ہے۔ آسمان کی شعلہ ریزیاں ساری فضا کو دہکتا ہوا انگارہ بنا دیتی ہیں۔ بادِ سموم کی ہلاکت سامانیاں تازگی و شگفتگی کی ہر نمود کو جھلس ڈالتی ہیں۔ پھول مرجھا جاتے ہیں۔ شگوفوں کی گردن کے منکے ٹوٹ جاتے ہیں۔ لالہ کا رنگ اڑ جاتا ہے۔ پتیاں سوکھ جاتی ہیں۔ شاخیں پژمردہ ہو جاتی ہیں۔ لہلہاتی کھیتیاں خشک ہو جاتی ہیں۔ سرو و صنوبر آتشدانِ ارضی کے دودکش دکھائی دیتے ہیں۔ تابندہ چشمے دیدۂ کور کی طرح بے نور ہو جاتے ہیں۔ مرمریں ندیاں خطِ تقدیرِ محکوماں کی طرح بے آب رہ جاتی ہیں۔ لو کی دہشت سے سائے کانپتے ہیں، راستے ہانپتے ہیں۔

خشکی غاروں میں منہ چھپا لیتی ہے۔ ٹھنڈک سہم کر کونوں میں جا دبکتی ہے۔ وفور تپش سے سینۂ کائنات میں سانس رکنے لگتی ہے۔ جنگل کے جانور آسمانی شعلوں کی لپیٹ سے کہیں پناہ نہیں پاتے۔ پرندے اپنے گھونسلوں میں نرم و نازک زبانیں نکالے نڈھال ہو کر پڑ جاتے ہیں۔ طائر نگاہ تک بھی کاشانۂ چشم میں سمٹ کر رہ جاتا ہے۔ انسان، زندگی اور اس کی تمام لطافتوں سے مایوس ہو جاتا ہے۔ سوختہ بخت کسان کھیت کے کنارے کھڑا للچائی نظروں سے آسمان کی طرف دیکھتا ہے کہ کہیں سے اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان دکھائی دے لیکن اس کی خاسر و نامراد نگاہیں، حسرت بن کر اس کے ویرانۂ قلب میں لوٹ آتی ہیں۔ اس طرح جب حیات ارضی کے کسی گوشے میں بھی امید کی نمی باقی نہیں رہتی، اور بساط کائنات کے کسی کونے میں بھی زندگی کی کوئی تازگی دکھائی نہیں دیتی تو یاس و نا امیدی کے اس انتہائی عالم میں سحاب فیض کی کرم گستری سے سحاب رحمت کسان کی آنکھوں کا نور بن کر فضائے آسمانی پر چھا جاتا ہے اور اپنی جواہر پاشیوں اور گہر ریزیوں سے دامن ارض کو بھرپور کر دیتا ہے۔ زمین مردہ میں پھر سے زندگی آ جاتی ہے۔ رگ کائنات میں نبض حیات پھر سے متموج ہو جاتی ہے۔ فضا کے سینے میں رکی ہوئی سانس پھر سے زندگی کی جوئے رواں بن جاتی ہے چشموں کی خشک آنکھیں شراب زندگی کے چھلکتے ہوئے جام نور بن جاتی ہیں۔ ندیوں کی بے آب لکیریں بادۂ جانفزا کی مسیحا نفسی سے رگ جان میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ سہمی ہوئی خشکیاں غاروں سے نکل کر فضاؤں پر چھا جاتی ہیں۔ دبکی ہوئی برودتیں کونوں کی تہوں سے اچھل کر بساط ارض پر پھیل جاتی ہیں۔ خشک پتیوں میں جان پڑ جاتی ہے۔ مرجھائے ہوئے پھولوں میں از سر نو تازگی و شگفتگی آ جاتی ہے۔ شگوفے چٹخنے ہیں، کلیاں مہکتی ہیں، ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے نفیس و لطیف جھونکے، سرسبز و شاداب درختوں کی شاخوں میں لچک اور پھولوں میں لیں جنبش، پیدا کر دیتے ہیں گویا ـــــ بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں۔ ہر طرف ایک نئی زندگی اور ہر سمت ایک حیات تازہ، جھومتی، مسکراتی، مچلتی، لوٹتی، ایک ایسی جنت نگاہ بن جاتی ہے، جس کی ہر روش میں مسرتوں کے چشمے ابلتے اور ہر تختے میں قہقہوں کے پھول کھلتے دکھائی دیتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِن بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَيَنشُرُ رَحْمَتَهُ (۴۲/۲۸)

اور وہ اللہ ہی کی ذات ہے جو ایسی نا امیدیوں کے بعد اپنے سحاب کرم کو بھیجتی اور اس طرح اپنی بساط رحمت کو صفحۂ ارض پر بچھا دیتی ہے۔

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۚ (۷/۵۷)

اسی کی ذات ہے جو (زمین کے جھلس جانے کے بعد) ان ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کو بھیجتی ہے جو اس کے ابر کرم کی پیشوائی میں ایک حیات نو کی بشارت دیتی ہیں۔ پھر وہ پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کو اپنے کندھوں پر اٹھا لاتی ہیں جن سے ہم اجڑی ہوئی بستیوں کو سیراب کرتے ہیں اور زمین مردہ سے طرح طرح کے پھل اگاتے ہیں۔

فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۔ (۳۰:۵۰)

پس اگر تم آنکھوں میں بصارت کے ساتھ بصیرت بھی رکھتے ہو تو اللہ تعالیٰ کے ان آثارِ رحمت کو دیکھو اور غور کرو کہ وہ زمین کو اس کی موت کے بعد کس طرح حیاتِ تازہ عطا کرتا ہے۔

یہ فطرت کا نظام ہے۔ یہ اس کا قانون ہے جس کے قوانین اٹل اور جس کے آئین غیر متبدل ہیں یہ اس کا قاعدہ ہے جس کے قواعد و ضوابط میں تبدیلی نہیں ہوا کرتی، کہ تبدیلیاں زمان و مکان کے اثرات کا نتیجہ ہوتی ہیں اور اس کی ذات زمان و مکان کی قیود سے ماورا اور ان کے اثرات سے بے نیاز ہے۔

لیکن ان مادی تشبیہات و استعارات سے ہٹ کر ذرا دنیائے انسانیت کی طرف آئیے اور دیکھئے کہ وہاں بھی یہی اصولِ فطرت کس طرح کارفرما اور یہی آئینِ مشیت کس طرح عمل پیرا ہے۔ یہ مادی تشبیہات و استعارات بھی درحقیقت اسی مقصد کے لئے بیان کئے جاتے ہیں کہ انسان ان محسوسات کی راہوں سے مجرد حقیقتوں کی طرف آئے اور جو کچھ عالمِ آفاق میں ہو رہا ہے اس سے عالمِ انفس پر دلیل لائے۔ گذشتہ اوراق میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ آج سے چودہ سو سال پیشتر دنیائے انسانیت کی کیا کیفیت ہو چکی تھی۔ تاریخ کی یادداشتیں اس پر شاہد ہیں کہ اس وقت عالمِ انسانیت کی خشک سالی اس سے کہیں زیادہ شدید و مہیب تھی جس کا تشبیہی ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس وقت شجرِ زندگی کی ہر شاخ سے نمی خشک ہو چکی تھی۔ تہذیب و تمدن کے پھول وحشت و بربریت کی بادِ سموم سے مرجھا چکے تھے۔ حسنِ عمل کے زندگی بخش چشمے یکسر خشک ہو چکے تھے۔ زمین پر جوہرِ انسانیت کی سرسبزی و شادابی کا کہیں نشان تک باقی نہ تھا۔ کشتِ مذاہب و اخلاق کے حدود تو باقی تھے لیکن فصلیں بالکل اجڑ چکی تھیں اس وحشت و سراسیمگی کے عالم میں خاسر و نامراد انسان ادھر اُدھر مارا مارا پھرتا تھا لیکن خدا کی اس وسیع زمین پر اسے کہیں زندگی کا نشان اور تازگی کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ چاروں طرف سے مایوس و ناامید ہو کر اس کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھتی تھیں اور ایک پکار سننے والے کو پکار پکار کر کہتی تھیں کہ متیٰ نصر اللہ! یہ وقت تھا کہ فطرت کے اس اٹل قانون کے مطابق جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، اس افسردگی و پژمردگی کو پھر سے تازگی و شگفتگی میں بدل دیا جاتا[1]۔ چنانچہ اس کے لئے اس رب ذوالمنن کا سحابِ کرم، زندہ امیدوں اور تابندہ آرزوؤں کی ہزار جنتیں اپنے آغوش میں لئے، ربیع الاول کے مقدس مہینے میں فاران کی چوٹیوں پر جھوم کر آیا اور بلد امین کی مبارک وادیوں میں کھل کھلا کر برسا جس سے انسانیت کی مرجھائی ہوئی کھیتیاں لہلہا اٹھیں۔ اخلاق و تمدن کے پژمردہ پھولوں پر پھر سے بہار آگئی۔ عمرانیت و مدنیت کے سبزۂ پامالی میں نزہت و لطافت پیدا ہو گئی۔

---

[1] حیاتِ کائنات وجدانی طور پر اپنے تقاضوں کو محسوس کرتی ہے اور نازک اوقات پر اپنا رخ متعین کر لیتی ہے۔ اس کو ہم مذہب کی زبان میں وحی نبوت سے تعبیر کرتے ہیں۔ (اقبالؒ)

اعمالِ صالحہ کے خشک چشمے، حیاتِ تازہ کی جوئے رواں میں تبدیل ہو گئے۔ طغیانی و سرکشی کی بادِ سموم، عدل و احسان کی جاں بخش نسیمِ سحری میں بدل گئی۔ فضائے عالم مسرتوں کے نغموں سے گونج اٹھی۔ انسان کو نئی تازگی اور زندگی کو نئے ولولے عطا ہوئے۔ آسمان نے جھک کر زمین کو مبارکباد دی کہ تیرے بختِ بلند نے یاوری کی اور تیرے خوش نصیب ذروں کو اس ذاتِ اطہر و اعظم کی پابوسی کی سعادت نصیب ہو گئی جو عالمِ موجودات کے سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی ہے۔ جس سے شرف و مجدِ انسانیت کی تکمیل ہو گئی جو علم و بصیرت کے اس افقِ اعلیٰ پر جلوہ بار ہے جہاں عقل و عشق، فکر و نظر، ناسوت و لاہوت، یہ دونوں، قوسین کی طرح آپس میں ملتے ہیں جو دانشِ نورانی و حکمتِ برہانی کے اس مقامِ بلند پر فائز ہے، جہاں غیب و شہود کی وادیاں دامنِ نگاہ میں سمٹ کر آجاتی ہیں۔ ہاں تو آسمان نے خوش بخت زمین کی بارگاہِ عالیہ میں جھک جھک کر ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کیا تو امینِ فطرت نے "جنت سے نکالے ہوئے ابنِ آدم" کے اس طالعِ بیدار کا تقدیس و تحمید کے زمزموں سے استقبال کیا۔ دنیا سے طاغوتی قوتوں کے تختے اُلٹ گئے کہ وہ آنے والا آگیا جس کی آمد ملوکیت و قیصریت کے لئے پیغامِ فنا تھی۔ ایران کے آتشکدوں کی آگ ٹھنڈی پڑ گئی کہ اب انسانی تصورات کی دنیا نار کی جگہ نور سے معمور ہو گئی۔ دنیا کے صنم کدوں کے بت پاش پاش ہو گئے کہ آج مسلکِ ابراہیمیؑ کی تکمیل کا دن آگیا۔ شیاطین نے پہاڑوں میں جا کر منہ چھپایا کہ اب جور و استبداد کی ہر طاغوتی قوت کے روپوش ہونے کا وقت آگیا۔ دنیا سے باطل کی تاریکیاں دور ہو گئیں کہ آج اس آفتابِ عالمتاب کا طلوع ہوا جس کے بھیجنے والے نے اسے "جگمگاتا چراغ" کہہ کر پکارا۔ إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ شَٰهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا وَدَاعِيًا إِلَى ٱللَّهِ بِإِذْنِهِۦ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا۔ وہ آنے والا جس کی آمد کا مقصد یہ بتایا گیا کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَٱلْأَغْلَٰلَ ٱلَّتِى كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷) جب وہ آیا تو اس نے ان تمام اغلال و سلاسل کو ایک ایک کرکے توڑ دیا جن میں انسانیت جکڑی ہوئی چلی آرہی تھی۔ احبار و رہبان کی برہمنیت کے اطواق و سلاسل، قیصر و کسریٰ کی زنجیریں، توہم پرستی کی بصیرت سوز بندشیں، تقسیمِ انسانیت کے انسانیت کش نسلی، جغرافیائی، وطنی، غیر فطری معیار، سب ایک ایک کرکے ٹوٹتے چلے گئے۔ اور پابندِ قفس طائرِ لاہوتی کو پھر سے آزادی کی فضائے لبیطا میں اڑن بال کشائی عطا ہوا، اور انسان ایک مرتبہ پھر زمین پر سر اونچا کرکے چلنے کے قابل ہو گیا۔ انسانیت کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی سیدھی راہ مل گئی۔ عقل کو عشق کا جنون اور عشق کو عقل کی فرزانگی عطا ہوئی۔ فقر کو شکوہِ خسروی اور بادشاہی کو استغنائے قلندری عنایت ہوا۔ یہ تھی وہ ذاتِ گرامی کہ

محبت از نگاہش پائدار است
سلوکش عشق و مستی را عیار است
مقامش عبدہٗ آمد و لیکن
جہانِ شوق را پروردگار است

إِنَّ ذَٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتَىٰ ۚ (۳۰)

اس طرح وہ دلوں کی مردہ بستیوں میں پھر سے زندگی کا سامان پیدا کر دیتا ہے۔

پھر اس حقیقت باہرہ کو باندازِ دگر دیکھئے۔ آویزشِ ابلیس و آدم سے سلسلۂ رشد و ہدایت کی ابتدا ہوئی۔ ابلیسانہ قوتوں کی تائید میں کشش و جاذبیت کا وہ تمام نگاہ فریب سامانِ رنگ و تعطر تھا جو نگارخانۂ طلسم و حیرت کے دامن میں بھر کر رکھ دیا گیا تھا اور اس کی دوسری طرف انسانی راہ نمائی کے لئے پیغامِ ازلی جو مبدأ فیض کی شانِ ربوبیت سے انسانوں تک پہنچتا رہا۔ عقلِ انسانی طبیعاتی زندگی ہی کو سفرِ حیات کی منزلِ آخری قرار دے کر اعلیٰ مقاصد اور بلند اقدار کو اس کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ لیکن یہ پیغامِ ازلی اس کے سامنے طبیعاتی زندگی کی آرائشوں کے ساتھ ساتھ شرفِ انسانیت کی بلند حقیقتوں کو بھی بے نقاب کرتا تھا۔ اس پیغام کی لِم لیکن تھی۔ حقیقت ایک تھی۔ لیکن جوں جوں اس طلسم کدۂ رنگ و بو کی پیچیدگیاں بے نقاب ہوتی جاتی تھیں پیغامِ ازلی کے اصولوں کی فروعات میں بھی مناسب رد و بدل اور ضروری تغیر و تبدل ہوتا جاتا تھا کہ طبیعی ارتقا کے ساتھ ساتھ جوہرِ انسانیت میں بھی بتدریج ارتقا ہوتا جائے۔ یہ ارتقائی مدارج تکمیل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ رہروانِ شوق کا یہ کارواں سوئے منزل جادہ پیما تھا۔ ان پیغامبرانِ حیاتِ جاوید کا ہر ایک قدم ایک خاص سمت اٹھتا اور ہر نشانِ راہ ایک نکتہ آخریں کی طرف اشارہ کرتا جاتا۔ چنانچہ آنے والوں میں سے جو کوئی اپنے منصب کی تکمیل کے بعد واپس جاتا تو جاتے وقت ایک آخری آنے والے کا پتہ نشان بتا کر جاتا۔ تاکہ جب وہ آنے والا آئے تو یہ قافلہ بلا تامل و توقف اس کے پیچھے ہولے اور راہ گم کردہ مختلف وادیوں میں سرگرداں و حیراں نہ پھرتا رہے۔ اس لئے کہ یہ سب ایک ہی سلسلۂ زریں کی مختلف کڑیاں تھیں جن میں کی ہر کڑی سلسلہ کی آخری کڑی کی روشن دلیل تھی۔ یہ سب ایک ہی کتابِ فطرت کے اوراق و ابواب تھے جن میں کا ہر ورق اور ہر باب، کتاب کے آخری باب کی تمہید تھا۔ یہ سب ایک ہی شجرِ طیب کی شگفتہ شاخیں تھیں جو ایک گلِ سر سبد کے لئے نویدِ بہار تھیں۔ چنانچہ جب مشیتِ ایزدی کی یہ تدبیرِ محکم جس کے لئے یہ زمین و آسمان قرنہا قرن سے یوں سرگرداں پھر رہے تھے، اپنی پختگی تک پہنچی، جب انسانیت جس کے لئے کائنات نے ایک ذرے کو لاکھوں چکر دیئے تھے گہوارۂ طفولیت سے حریمِ شباب میں آگئی، جب اس صحیفۂ فطرت کی تکمیل کا وقت آ گیا جس کے مختلف اوراق ستاروں کی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی میں کوثر و تسنیم سے دھلے ہوئے قلم سے لکھے گئے تھے، جب سینۂ کائنات میں اتنی کشادگی پیدا ہو گئی کہ وہ اپنے اندر رازہائے درونِ پردہ کے معدنِ لعل و گوہر کو سمو لے تو آسمان کی حوریں زمین پر اتریں کہ جنت کے تر و تازہ پھولوں سے وادیٔ بطحا کی تزئین و آرائش کریں۔ صحنِ گلستانِ کائنات پہ بہار آ گئی۔ ہر طرف سے مسرتوں کے چشمے ابلنے لگے۔ چاند مسکرایا، ستارے ہنسے۔ آسمان سے نور کی بارش ہوئی۔ فرشتوں

کی معصوم نگاہوں میں اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کی تفسیر، ایک پیکرِ محبوبیت کا حسین تصور بن کر چمکنے لگی۔ فلک تعظیم کیلئے جھکا، زمین نے اپنی خاک آلود پیشانی سجدہ سے اٹھائی کہ آج اس کی قرنہا قرن کی دعاؤں کی قبولیت کا وقت آپہنچا تھا۔ صحرائے حجاز کے ذرے جگمگا اٹھے، بلدِ امین کی گلیوں کا نصیبہ جاگا کہ آج اس آنے والے کی آمد آمد تھی جس کی طرف جبلِ سینین پر حضرت نوحؑ نے اشارہ کیا تھا اور جسے کوہِ زیتون پر حضرت مسیحؑ نے اپنے حواریوں کو وجہِ تسکین خاطر بتایا تھا، جس کی آمد کی بشارتیں وادیِ طورِ سینین میں بنی اسرائیل کو دی گئی تھیں اور جس کے لئے دشتِ عرب میں حضرت خلیلِ اکبرؑ اور ذبیحِ اعظمؑ نے اپنے خدا کے حضور دامن پھیلایا تھا۔ وہ آنے والا کہ جس کے انتظار میں زمانہ نے لاکھوں کروٹیں بدلی تھیں، آیا اور اس شانِ زیبائی و رعنائی سے آیا کہ زمین و آسمان میں تہنیت کے غلغلے بلند ہوئے۔ فرشتوں نے زمزمۂ تبریک گایا۔ سدرۃ المنتہیٰ کی حدود فراموش شاخوں نے جھولا جھلایا۔ ملاءِ اعلیٰ کی مقدس قندیلوں نے چراغاں کیا۔ کائنات کے ذرے چمک اٹھے۔ فضائے عالم درود و صلوٰۃ کی فردوس گوش صداؤں سے گونج اٹھی۔ اور انس و جان وجد و کیف کے عالم میں پکار اٹھے کہ

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا
اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
در جہانِ ذکر و فکر و انس و جاں
تو صلوٰۃِ صبح، تو بانگِ اذاں

یہ آنے والا رسولؐ کافۃ للناس و رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل و حریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اسی کتابِ مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ محمدیؐ میں اتاری گئی۔ مشامِ جاں نوازنے جہاں کہیں بھی عطر بیزی و عنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمن کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبیِ آخر الزماںؐ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدیؐ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی و سماوی کی آندھی کے تیز جھونکوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا اور مقامِ محمدیؐ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ و تابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن و زیبائی کہ جن کی حقیقی آب و تاب کو ان کے ستائش گروں کی مفرطانہ عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے اور یہاں یہ پیکر

جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے اور یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب تاب سے موزوں ہوگئے تھے جو ضمیر کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے، یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے، یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے، یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے، یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے، یہ خط مستقیم تھا۔ وہ ابتدا تھی، یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست

رحمۃ للعالمینی انتہاست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ فطرت انسانی کے تقاضوں کی تسکین اور اس کے شرف و مزیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی دوسری مشعل راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراط مستقیم تھی جس پر اس ذات اقدس و اعظم کے نقوش قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر خبیر و بصیر پکار اٹھتا ہے کہ

مقام خویش اگر خواہی دریں دیر

بحق دل بند و راہ مصطفیٰ رو

یہ تھا حاصل بہار حسین کائنات، کہ جس کا ظہور صبح بہار کائنات تھا۔

وہ راز خلقت ہستی، وہ معنیٔ کونین

وہ جان حسن ازل، وہ بہار صبح وجود

وہ آفتاب حرم، نازنین کنج حرا

وہ دل کا نور وہ ارباب درد کا مقصود

وہ سرورِ دو جہاں وہ محمدؐ عربی
بروحِ اعظم و پاکش درودِ لا محدود

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (۳۳/۵۶)

جہانِ نو

نوعِ انسانی خشک نیستاں کی طرح ایک شرارہ کے انتظار میں تھی۔ وہ بجلی کا شرارہ اس طفلِ جلیل کے پیکر میں آسمان سے آیا اور تمام نوعِ انسانی کو شعلہ صفت بنا گیا۔ (کارلائل)

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، کسی انسان کی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کے ماپنے کا پیمانہ یہ ہے کہ جب وہ دنیا میں آیا تو اس نے دنیا کو کیسے پایا اور جب وہ یہاں سے گیا تو دنیا کو کس حالت میں چھوڑا۔ اگر اس نے دنیا کو حق و صداقت کے لئے ناسازگار اور عدل و انصاف کے لئے نامساعد پایا تو دیکھنا یہ ہوگا کہ اس نے اس ناسازگاری کو سازگاری اور نامساعدت کو مساعدت میں بدلنے کے لئے کیا کچھ کیا اور اس کی اس تگ و تاز و سعی و کاوش کا نتیجہ کیا نکلا

مرد خود دارے کہ باشد پختہ کار — با مزاجِ او بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں — می شود جنگ آزما با آسماں
بر کند بنیادِ موجودات را — می دہد ترکیبِ نو ذرات را
می کند از قوتِ خود آشکار — روزگارِ نو کہ باشد سازگار

جس حیاتِ طیبہ کے تذکارِ جلیلہ و کوائفِ جمیلہ ہمارے لئے وجہ شادابیٔ قلب و نگاہ اور باعث افزائش ایمان و بصیرت

ظہورِ نبوت کے وقت دنیا کی حالت

ہوئے ہیں اس نے جب اس مسکنِ انسانی میں چشمِ نبوت وا کی تو اسے جس عالم میں پایا اس کا اجمالی تذکرہ کتاب زیرِ نظر کے ابتدائی عنوان (ظہر الفساد) میں آ چکا ہے۔ اس عنوان کو دہرانا تحصیل حاصل ہوگا۔ البتہ تجدیدِ یادداشت کے لئے اس کے ایک اقتباس کے تکرار کو ضروری سمجھا گیا ہے۔

جس میں عصر حاضر کے تاریخ تہذیب کے مورخ نے بتایا ہے کہ اُس وقت دنیائے تہذیب و تمدن کی کیا حالت ہو چکی تھی۔ وہ لکھتا ہے:

اس وقت ایسا دکھائی دیتا تھا کہ تہذیب کا وہ قصر مشید جس کی تعمیر میں چار ہزار سال صرف ہوئے تھے منہدم ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اور نوعِ انسانی پھر اسی بربریت کی طرف لوٹ جانے والی تھی جہاں ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے خون کا پیاسا تھا اور آئین وضوابط کو کوئی جانتا تک نہ تھا۔ قدیم قبائلی آئین وممالک اپنی قوت واحترام کو کھو چکے تھے۔ اس لئے اب ملوکیت کے پرانے طرق وانداز کا سکہ دنیا میں نہیں چل سکتا تھا۔ عیسائیت نے جن قواعد وضوابط کو رائج کیا تھا وہ نظم و ضبط اور وحدت ویک جہتی کی بجائے تشتت وافتراق اور بربادی وہلاکت کا موجب بن رہے تھے غرضیکہ وقت وہ آچکا تھا جبکہ ہر طرف فساد ہی فساد نظر آتا تھا۔ تہذیب کا وہ بلند وبالا درخت جس کی سرسبز وشاداب شاخیں کبھی ساری دنیا پر سایہ فگن تھیں، اور آرٹ۔ سائنس اور لٹریچر کے سنہری پھلوں سے لدی ہوئی تھیں، اب لڑکھڑا رہا تھا۔ عقیدت واحترام کی زندگی بخش نمی اس کے تنے سے خشک ہو چکی تھی اور وہ اندر تک سے بوسیدہ اور کھوکھلا ہو چکا تھا۔ جنگ وجدال کے طوفان نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے جو صرف پرانی رسموں کے بندھن سے یک جا کھڑے تھے۔ اور جن کے متعلق ہر وقت خطرہ تھا کہ اب گرے یا اب۔ کیا (ان حالات میں) کوئی ایسا جذباتی کلچر پیدا کیا جا سکتا تھا جو نوعِ انسانی کو ایک مرتبہ پھر ایک نقطہ پر جمع کر دے اور اس طرح تہذیب کو مٹنے سے بچا لے! اس کلچر کو بالکل نئے انداز کا ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ پرانی رسومات وآئین سب مردہ ہو چکے تھے اور ان ہی جیسے اور قوانین مرتب کرنا صدیوں کا کام تھا۔

یہ تھی وہ حالت جس میں اس داعیٔ انقلاب نے دنیا کو پایا۔ جو دنیا کو ایک طرح نو سے آشنا کرنے کے لئے آیا تھا۔ کیا اس نے

انقلاب کے نتائج

دنیائے تہذیب وتمدن کے ان تقاضوں کو پورا کیا جس کی طرف اوپر کے اقتباس میں اشارہ کیا گیا ہے؟ اس کا جواب ہم سے نہیں خود اس اقتباس کے مصنف کی زبان سے سنئے جو کہتا ہے:

یہ امر موجب حیرت واستعجاب ہے کہ اس قسم کا نیا کلچر عرب کی سرزمین سے پیدا ہوا۔ اور اس وقت پیدا ہوا جبکہ اس کی اشد ضرورت تھی۔

یہ حیرت انگیز کلچر اسی ذاتِ گرامی کی عدیم النظیر تعلیم اور فقید المثال عمل کا درخشندہ نتیجہ تھا۔ جس کی تعلیم وعمل نے دنیا کو بتا دیا کہ ایک انسان دنیا میں کیا کچھ کر سکتا تھا۔

ہم میں سے ان لوگوں کے لئے جن کے نزدیک **انسان** ہی سب کچھ ہے، ماحول کچھ نہیں، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس حقیقت کی عظیم الشان مثال ہے کہ ایک انسان کیا کچھ کر سکتا ہے لیکن وہ لوگ بھی جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ تاریخ کے

انقلابات کسی ایک فرد کی کوششوں سے کہیں زیادہ ماحول کی خصوصیات اور قلبِ انسان کی استعدادِ قبولیت کے رہینِ منت ہیں۔ اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ اگر تاریخ میں ایسا انقلاب آنا ہی تھا (جو عرب میں آیا) تو محمد (صلعم) کے بغیر یہ انقلاب ایک غیر متعین عرصہ تک معرضِ التوا میں رہتا!

Pringle Kennedy in Arabian Society at the time of Mohamad. P. 21

یہ انقلاب کیا تھا؟

عربوں کے لئے یہ انقلاب ایک نئی زندگی تھی جو انھیں تاریکی سے نور کی طرف لے آئی تھی عرب اس کے ذریعے پہلی دفعہ زندہ ہوا۔ ایک ایسی قوم جو ابتدائے آفرینش سے گمنامی کے عالم میں ریوڑ چراتی پھرتی تھی ان کی طرف ایک رسول آیا جو اپنے ساتھ ایک ایسا پیغام لایا جس پر وہ قوم ایمان لے آئی۔ وہ دیکھو! وہی گمنام چرواہے دنیا کی ممتاز ترین قوم بن گئے۔ وہ حقیر قوم ایک عظیم الشان ملت میں تبدیل ہو گئی۔ ایک صدی کے اندر اندر عرب ایک طرف غرناطہ اور دوسری طرف دہلی تک چھا گئے۔ اس کے بعد سینکڑوں برس ہو چکے ہیں کہ یہ اسی شان و شوکت اور درخشندگی تابندگی سے کرۂ ارض کے ایک عظیم حصہ پر مسلط ہیں۔ (یہ سب ایمان کی حرارت سے ہوا۔) ایمان بہت بڑی چیز ہے ایمان ہی سے زندگی ملتی ہے۔ جونہی کسی قوم میں ایمان پیدا ہوا اس قوم کی تاریخ، اعمال میں نتائج اور روح میں بالیدگی پیدا کرنے والی بن گئی۔

وہ عرب یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ایک سو سال کا عرصہ!

کیا یہ انقلاب ایسا ہی نہیں جیسے ریت کے کسی گمنام ٹیلے پر آسمان سے بجلی کی لہر آگرے اور وہ ریت کا تودہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک آتشگیر مادہ میں تبدیل ہو کر اس طرح بھک سے اڑ جائے کہ دہلی سے غرناطہ تک اس کے شعلوں کی لپیٹ میں آجائے؟

نوعِ انسانی خشک نیستاں کی طرح ایک شرارہ کے انتظار میں تھی۔ وہ بجلی کا شرارہ اس بطلِ جلیل کی صورت میں آسمان سے آیا اور تمام نوعِ انسانی کو شعلہ صفت بنا گیا۔

Thomas Carlyle in Heroes and Hero Worship P. 66

اس نے کیا کیا؟

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اثر سے عربوں کی قبائلی عصبیت کا خاتمہ ہو گیا اور وہ ایک ایسے رشتہ میں منسلک ہو گئے جس سے

وہ اس سے پیشتر ناآشنا تھے۔ یہ رشتہ توحید کا عقیدہ تھا جو انھیں ایک مرکز پر لے آیا اور ان کی فتوحات کو ان کے لئے ممکن بنا دیا۔

The Eclipse of Christianity in Islam

By L.E. Browne . P.P. 24. 28.

تاریخ عرب کے مصنف (Hitti) کے الفاظ میں:

یہ عرب کی تاریخ میں پہلی کوشش تھی کہ انھیں خون کے بجائے مذہب کے نام پر ایک مرکز پر جمع کیا جا رہا تھا۔ اللہ اس سلطنت کا حاکم اعلیٰ تھا۔ اس کا رسول اپنی زندگی بھر اس کا نائب اور ملک کا فرمانروا۔ بنابریں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے روحانی فرائض کے علاوہ ایسے فرائض بھی سرانجام دیتے تھے جیسے سلطنتوں کے حکام۔ اس کی ملت میں سب کے سب قبائلی رشتوں اور پرانے علاقات سے یکسر منقطع ہو کر اصولاً بھائی بھائی بن چکے تھے۔

Hitti; History of the Arabs . P. 120.

اور (Rev. Stephenson) کے الفاظ میں:

سب سے پہلے اس حقیقت کا بلا تکلف اعتراف کر لینا چاہئے کہ اپنی قوم کے لئے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات بڑے احسانات کی موجب تھی۔ وہ اس ملک میں پیدا ہوئے جہاں سیاسی تنظیم، معقول عقائد اور پاکیزہ اخلاق سے کوئی شناسا نہ تھا۔ انھوں نے یہ تینوں چیزیں پیدا کر دیں۔ انھوں نے اپنی پختہ لطافت سے بیک وقت سیاسی حالت، مذہبی عقائد اور ضابطۂ اخلاق سب کی اصلاح کر دی۔ انھوں نے مختلف قبائل کی جگہ انھیں ایک قوم بنا دیا۔ مختلف دیوتاؤں اور آقاؤں کی جگہ ایک خدا پر ایمان کی تعلیم دی۔ اور بڑی بڑی معیوب اور قبیح رسومات کو بیخ و بن سے اکھیڑ دیا۔ جوں جوں اسلام اپنے قدم عرب کی سرزمین سے باہر رکھتا گیا کئی وحشی قومیں، جنھیں اس نے اپنے آغوش میں لیا، نعمائے اسلام کی وارث بنتی چلی گئیں۔ . . . . . اسلام (نوع انسانی کے لئے) برکات کا موجب، تاریکی سے نور، اور شیطان سے خدا کی طرف رجعت کا باعث ہے۔

نیز باسورتھ سمتھ کے الفاظ میں:

ایک ایسی خوش بختی کی بنا پر جو تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تین عناصر کا بانی ہے۔ ایک قوم، ایک

سلطنت اور ایک مذہب۔ تینوں کا بانی خود ان پڑھ تھا۔ لیکن اس نے دنیا کو ایک ایسی کتاب دی جو شعر و نغمہ بھی اپنے اندر رکھتی ہے اور آئین و قانون بھی۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہی معجزہ ہے مستقل معجزہ، فی الحقیقت معجزہ۔

Rev. Bosworth Smith.

ہر قسم کی توہم پرستی کا استیصال۔

ہمیں بلا تامل اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہئے کہ (تعلیم نبویؐ نے) ان تاریک توہمات کو ہمیشہ کے لئے جزیرہ نمائے عرب سے باہر نکال دیا جو صدیوں سے اس ملک پر چھا رہے تھے۔ بت پرستی خارج البلد ہو گئی۔ توحید اور خدا کی لامحدود رحمت کا تصور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متبعین کے دلوں کی گہرائیوں اور زندگی کے اعماق میں جاگزیں ہو گیا۔۔۔ معاشرتی اصلاحات کی بھی کوئی کمی نہ رہی۔ ایمان کے دائرہ میں برادرانہ محبت، یتیموں کی پرورش۔ غلاموں سے احسان۔ حرمتِ خمر سب جوہر نمودار ہو گئے۔ امتناعِ شراب میں جو کامیابی اسلام نے حاصل کی کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔

Sir William Muir – Life of Mohamad.

ہر عقیدۂ باطل کی اصلاح۔

اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مذہب نے ہر اس عقیدہ کی اصلاح کر دی جو اس سے قبل وہاں رائج تھا۔ اس نے متعارض و متخالف قبائل کو باہم ملا دیا۔ اور اس طرح اس قوم کو دنیا کی بڑی بڑی قوتوں سے بھی آگے کھڑا کر دیا۔

Dr. Marcus Dods – in Mohd, Budha & Christ.

محض "مذہبی ریفارمر" ہی نہیں، ایک عدیم النظیر طرزِ حکومت کے بھی طرح انداز

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک مذہب کے بانی نہ تھے ایک سلطنت کے بھی تھے۔ لیکن ایسی سلطنت کے جو شروع ہی سے دینی سلطنت تھی۔ یعنی جس میں دنیا اور آخرت دونوں کا امتزاج تھا۔ اسلام کے پیشِ نظر یہ تھا کہ تمام انسانوں کے امتیازات مٹا کر انھیں ایک جماعت بنا دیا جائے جس کا مسلک قانونِ خداوندی اور اس کے رسول کی اطاعت ہو۔ اور اس طرح حق کو ساری دنیا پر پھیلا دیا جائے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دنیا میں "خدا کی مرضی" کی تنفیذ و اشاعت کے لئے سب سے بڑھ کے

ایگزیکٹیو آفیسر تھے۔ انھوں نے اپنے پیشرو انبیاء کی طرح محسوس کر لیا تھا کہ تمام نوع انسانی ایک دن ایک ملت واحدہ بن کر رہے گی۔ ایک خدا کے ماتحت ایک حکومت للہ المشرق والمغرب فاینما تولوا فثم وجہ اللہ۔

Spalding – Civilisation in East & West. P. 164.

اور Georges Rivorie کے الفاظ میں

اسلام، اس دنیا کے لئے پیغام نجات و سعادت تھا جو جسمانی اور ذہنی مصائب میں مبتلا تھی اور دوسروں کی غلامی نے بے چین کر رکھا تھا۔ اس نے عدل و انصاف کے عصر جدید کا اعلان کیا۔ جس عالمگیر حکومت کی طرح اسلام نے رکھی اس میں نہ نسلی امتیاز کو کوئی دخل تھا نہ معاشرتی حدود کو۔ اس کا ایک ہی قانون تھا۔ سب کے لئے یکساں عدل اور محبت۔

اس حقیقت کبریٰ کو جتنی مرتبہ دہرایئے کم ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نہ صرف ایک ایسے عظیم القدر مذہب کا پیغمبر تھا جس نے اس دنیا کی روحانی تسکین کا سامان فراہم کر دیا جو خالص توحید کے لئے پیاسی تھی، بلکہ وہ ایک ایسے معاشرتی اور بین الاقوامی انقلاب کا معلن تھا جس کی نظیر تاریخ نے کبھی نہ دیکھی تھی۔

(Visages De L' Islam)

ایک ایسی حکومت جس میں جبر سے اختیار پیدا ہوا اور جس کی مثال دنیا نے نہ دیکھی ہو۔

انسان کے تمام فرائض حیات کو ایک لفظ میں سمیٹ کر رکھ دیا گیا ہے اور وہ لفظ ہے اسلام۔ یعنی اپنے جذبات اور ارادوں کو مشیت ایزدی کے تابع رکھنا۔ یہ تسلیم و رضا اس اطاعت و انقیاد سے یکسر مختلف ہے جو مادی ریاست میں حکومت کی طرف سے مطلوب ہوتی ہے۔ کسی مسولینی کے سامنے جھکنے اور خدا کے سامنے جھکنے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ جو خدا کے سامنے جھک کر مسلم بن جاتا ہے اس کے ذمہ اس دنیا اور اگلی دنیا دونوں کے فرائض عائد ہو جاتے ہیں۔ یعنی اخلاقی بھی اور روحانی بھی۔ خدا کی مرضی کا معلوم کرنا اور اس کی تعمیل کرانا۔ اس طرح مسلم بیک وقت ایک راہب اور ایک سپاہی بن جاتا ہے۔ نمازی بھی بنتا ہے اور میدان جنگ میں جانے کیلئے بھی ہر وقت تیار رہتا ہے لیکن صرف اس جنگ کیلئے جو دنیا سے شر کے استیصال کے لئے کی جاتی ہے۔

(Spalding P. 16)

اور (Raymond Lerouge) کے الفاظ میں

نبی عربی اس معاشرتی اور بین الاقوامی انقلاب کے بانی ہیں جس کا سراغ اس سے قبل تاریخ میں نہیں ملتا۔ انھوں نے ایک ایسی حکومت کی بنیاد رکھی جسے تمام کرۂ ارض پر پھیلنا تھا اور جس میں سوائے عدل اور احسان کے اور کسی قانون کو رائج نہیں ہونا تھا۔ ان کی تعلیم تمام انسانوں کی مساوات، باہمی تعاون اور عالمگیر اخوت تھی۔

(Vie De Mahomet PP 18.19)

انسانی مساوات کی ایسی دنیا جس کی نظیر کہیں اور نہیں مل سکتی۔

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مذہب نے اس حقیقی اور اولین جمہوریت کا اعلان کیا جو کسی انسان کے ذہن میں نہ آسکی تھی۔ اس کا خدا اتنی بلند و بالا کبریائی کا مالک تھا کہ اس کی نگاہ میں دنیا کے تمام امتیازات ہیچ اور رنگ و نسل کی تمام گہری خلیجیں ناپید تھیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ دوسروں کی مانند معاشرتی طبقات مسلمانوں میں بھی موجود ہیں لیکن بنیادی (یعنی روحانی) طور پر تمام مسلمان برابر ہیں۔ اور یہ بنیادی مساوات، عیسائیوں کی مساوات کی طرح محض افسانہ نہیں۔ بلکہ ایک مسلمہ حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے۔ ..... یہ صرف مسلمانوں کی ہی خصوصیت ہے کہ وہ اسود و احمر کے ظاہری امتیاز کے باوجود، ہر جگہ بطور ایک بھائی کے تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور اس جذبہ اخوت کی بنیاد رنگ و نسل نہیں بلکہ اس کا عقیدہ ہوتی ہے۔

Dr. Maude Royden in The problem of Palestine. P. 37

"دنیائے مذہب" میں ایک نئے باب کا اضافہ

اسلام مذہبی زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے۔ یہ معتقدات و رسومات کا مجموعہ نہیں۔ یہ تو ایک روحانی توانائی ہے۔ ایک تخم صالحہ اور زندہ۔ یہ اپنی زندگی میں بالیدگی پیدا کرتا ہے اور دوسری روحانی زندگیوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ یہ سب کچھ ایک ایسے آئینی ضابطہ کی رو سے کرتا ہے جس کا صحیح مفہوم اسی صورت میں سمجھ میں آسکتا ہے جب اسے وسیع پیمانہ پر عمل میں لایا جائے۔

Tor Andrae Mohd — The Man and his faith P. 11.

کھلا کھلا دین۔ آیاتِ بینات۔ واضح تعلیم۔

اسلام کوئی ناممکن الحصول نصب العین متعین نہیں کرتا۔ کوئی الہیاتی پیچیدگیاں نہیں۔ کوئی باطنی رموز و اسرار نہیں۔ کوئی برہمنیت کی وراثت نہیں۔ (Hitti. P. 124.)

ایک مکمل تہذیب۔

اسلام ایک ضابطۂ الہیات سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ ایک مکمل تہذیب ہے۔

(Gibb — Whither Islam P. 12)

ابدی حقائق کی بنیادوں پر قائم۔

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مذہب شک و ابہام سے بالکل مبرّی ہے اور قرآن، خدا کی توحید کی درخشندہ شہادت۔ نبی عربی نے بتوں، انسانوں اور اجرامِ سماوی کی پرستش اس بصیرت افروز دلیل کی بنا پر رد کر دیا کہ جو طلوع ہوتا ہے وہ غروب بھی ہوتا ہے۔ جو پیدا ہوتا ہے وہ مرتا بھی ہے۔ جس کی بنیاد میں فساد ہے اس کا مآل ہلاکت اور تباہی ہے۔ آپ کے دینی جوش اور ولولہ نے جو یکسر مبنی علی البصیرت تھا، خالق کائنات کی صورت میں اس لاانتہا ذات سرمدی کا اقرار کر کے اسے مرکزِ حمد و ستائش قرار دیدیا، جو صورت اور مکان کی جہت سے بلند اور اولاد اور مثیل کی نسبتوں سے بالا تھی۔ وہ ذات جو ہمارے پوشیدہ خیالات تک میں موجود اور خود اپنی ذات سے قائم ہے اور جس کے سرچشمہ سے عقل و اخلاق کے جوہروں کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہ مسلک توحید اس قدر بلند ہے کہ ہماری موجودہ استعداد کی وہاں تک رسائی نہیں ہو سکتی۔

جو چیز ہمارے لئے سب سے زیادہ وجہ حیرت ہے وہ اسلام کی اس قدر جلد اشاعت نہیں بلکہ یہ کہ اس کی تعلیم کس قدر ابدی حقائق پر مبنی ہے۔ وہی سادہ لیکن مکمل نقش جو محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مکہ اور مدینہ میں انسانی قلوب پر مسکوک کیا ان بارہ صدیوں کے انقلابات کے باوجود ہندوستان سے افریقہ تک قرآن کے مبلغین کے ہاں محفوظ چلا آتا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے مذہب اور عقیدہ کے مقصود کو عام انسانی حواس و تخیل کی سطح پر اترنے نہیں دیا۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ اسلام کا نہایت سادہ اور غیر متبدل عقیدہ ہے۔ ان کا خدائی تصور بھی کبھی مرئی ہستیوں کا شرمندہ نہیں ہو سکا۔ رسول اللہ کا درجہ کبھی بشریت کی حد سے متجاوز نہیں کر سکا۔ اسکی

زندہ تعلیمات نے اس کے متبعین کے جذبات عقیدت کو دین و دانش کے حدود سے باہر نہیں جانے دیا۔ یہ ہے اسلام کی سادہ اور ابدی تعلیم۔

Gibbon - Decline & Fall of Roman Empire P.P. 287 & 352.

وہ ضابطۂ حیات جس نے انسانیت کو ایک نئی فکر سے روشناس کرایا۔

دنیا کی مقدس کتابوں میں قرآن ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔ اگرچہ یہ اپنی نوع کے لٹریچر میں سب سے کمسن واقع ہوا ہے لیکن اس اثر کے اعتبار سے جو اس نے نوع انسانی کے دلوں پر کیا ہے کوئی اس پر غالب نہیں آسکتا۔ اس نے انسانیت کو ایک نئے فکر سے روشناس کرایا ہے اور اسے ایک جدید انداز کی سیرت عطا کی ہے۔ اس نے جو محیر العقول اصلاحات کیں اور تعجب انگیز کامیابیاں حاصل کیں، وہ محض عہد کہن کی داستانیں نہ تھیں وہ آج بھی یہی کچھ کر رہا ہے۔

(Margoliouth)

زندگی کے ہر شعبہ میں خضر راہ۔

اسلام میں قرآن، وسیع ترین مفہوم میں، ضابطۂ حیات تھا جو ایک فرد کی زندگی کی انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں کو محیط تھا اور اس کی ہر شعبہ میں ہدایت کرتا تھا۔ آج تک مسلمانوں کی ہر جماعت کے لئے قرآن ایک ناقابل تغیر اصول زندگی ہے۔ یہ الٰہیات، شعائر و مناسک، دیوانی اور فوجداری قوانین اور اخلاقی ضوابط سب کا مجموعہ ہے۔

Religion in Science and Civilisation
By Sir Richard Gregory P. 80

مستقل انقلاب

ایک وقتی اور ہنگامی انقلاب نہیں کہ جو بگولے کی طرح اٹھے اور حباب کی طرح بیٹھ جائے۔ بلکہ ایک ایسا انقلاب جس نے حیات کائنات کو متاثر کر دیا جس نے انسانی ضمیر کی گہرائیوں میں جگہ پکڑی، جس نے دنیا کی نگاہوں کا زاویہ بدل دیا وہ انقلاب جس نے جہالت کی تاریکیوں کو علم کی روشنی سے بدل دیا۔ جس نے "مذہب" جیسی خالصۃً جذباتی چیز کی بنیاد بصیرت پر رکھی اور عقل و دانش کی بے کیف و بے رنگ دنیا کو عشق کی مستیوں اور رنگینیوں سے معمور کر دیا۔ جس نے

ایاز کو آئینِ غزنوی اور غزنوی کو آدابِ ایازی سکھا دیئے۔ وہ بانگِ درا جس نے انسانیت کے راہ گم کردہ قافلہ کو صحیح راستہ پر لگا دیا۔ جس نے علم و عقل سے راستہ کے چراغ روشن اور ایمان و ایقان سے منزل کے نشان متعین کئے۔ غرضیکہ وہ انقلاب جس نے دنیا کو وہ سب کچھ دیا جس پر آج دنیا اس طرح فخر کر رہی ہے۔ اگر تاریخ انسانیت میں یہ انقلاب نہ آتا تو دنیا آج مٹی کے گھروندے سے زیادہ کچھ نہ ہوتی اور انسان ابھی تک اپنے ارتقاء کی ابتدائی منازل میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا۔ سنئے کہ خود یورپ کے اربابِ علم و ہنر اس حقیقت کا اعتراف کیسے واضح الفاظ میں کرتے ہیں۔

> اس (عہدِ ظلمت کے بعد) ازمنۂ متوسطہ میں جو جو ترقیاں ہوئیں وہ عربوں کے اثر کا نتیجہ تھیں۔ عیسائیت اور اسلام صلیبی جنگوں کے سلسلہ میں ایک دوسرے کے قریب آئے۔ جس طرح بلعم بنی اسرائیل پر لعنت بھیجنے کے لئے آیا لیکن ان کیلئے برکت کا موجب بن گیا۔ اسی طرح مسیحی دنیا مسلمانوں کے خلاف صلیبی لڑائیاں لڑنے کے لئے آئی لیکن مسلمانوں کے قدموں میں بیٹھ گئی تاکہ ان سے تحصیل علم کرے۔ صلیب کے نیم وحشی سپاہیوں نے دیکھا کہ یہ کفار (یعنی مسلمان) اگرچہ مذہبی طور پر ان کے نزدیک) قابلِ ہلاکت ہیں لیکن وہ ایک ایسی تہذیب کے مالک ہیں جو ان کی اپنی تہذیب سے بدرجہا فائق ہے۔ مسلم ثقافت کا ہی وہ اثر تھا جس نے ازمنۂ متوسطہ کی تاریکیوں کا خاتمہ کر کے عہدِ حاضر کی روشنی کا آفتاب طلوع کیا۔
>
> The Science of History By F. J. C. Hearushaw.

اسی انقلاب سے یورپ کی زندگی کی ابتداء ہوئی۔

> مسلمانوں نے صرف ملکوں کو فتح نہیں کیا۔ انھوں نے اپنی مفتوحہ زمینوں میں اسلام کی تخم ریزی کی۔ اس تخم سے مساجد کا وجود منصۂ شہود پر آیا۔ ہر مسجد کا اپنا مکتب تھا۔ علم کے متلاشی سیاسی مدبرین سے بھی زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ایک قافلۂ تجارت جہاں ریشم اور سوتی کپڑے لاد کر لاتا تھا اس کے ساتھ ہی اس کے اونٹوں پر ہندوستان اور بازنطین کی کتابوں کے مسودے اور اقصائے عالم سے معدنیات اور نباتات کے نمونے بھی لدے ہوتے تھے . . . . . کتب خانے اور درسگاہیں زندگی کا جزو بن چکی تھیں . . . . . یہ انسانی ذوق کا ایک نیا کھیل تھا جسے نہایت جوش و انہاک سے کھیلا گیا . . . . . اس کھیل کو یونانیوں نے بھی اس حسن و خوبی سے نہیں کھیلا . . . . . ان ہی عربوں کے ہاتھوں یورپ نے زندگی کی ابتدا پائی اور ان ہی سے اس نے فلکیات، نباتات، کیمیا، قانون، ریاضی، طب اور فلسفہ کا پہلا سبق لیا۔
>
> Dorsey; Civilisation PP. 644-45.

اسی سے ساری دنیا حیاتِ نو سے روشناس ہوئی۔

یورپ کی نشاۃ ثانیہ پندرہویں صدی میں نہیں ہوئی۔ بلکہ اس وقت ہوئی جب یورپ عربوں کے کلچر سے متاثر ہوا۔ یورپ کی خلقتِ جدیدہ کا گہوارہ اٹلی نہیں بلکہ اندلس ہے۔ ادھر روما کی تہذیب گرتے گرتے بربریت کی حد تک پہنچ چکی تھی اور ادھر دنیائے اسلام (بغداد، قرطبہ، قاہرہ) تہذیب و ذہنی تحریکات کے مرکز بن رہے تھے۔ ان ہی شہروں میں وہ نئی زندگی نمودار ہوئی جسے انسانی ارتقاء میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنا تھا۔ جس وقت نئی تہذیب محسوس طور پر سامنے آئی، دنیا حیاتِ نو سے شناسا ہوئی۔ . . . اگر عرب نہ ہوتے تو یورپ کی تہذیب کا وجود عمل میں نہ آتا۔ ان کے بغیر یہ یقیناً اُس خصوصیت کو حاصل نہ کرسکتا تھا جس نے اسے ارتقائی مراحل میں بلند ترین سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔ مغربی کلچر میں کوئی ایسا شعبہ نہیں جس میں عربی ثقافت کا رنگ نہ جھلکتا ہو۔ لیکن ایک شعبہ تو ایسا ہے جس میں یہ اثر بالکل نکھر کر سامنے آجاتا ہے اور یہی وہ شعبہ ہے جو درحقیقت عصرِ حاضر کی حقیقی قوت کا باعث اور اس کی فتوحات کا ذریعہ ہے یعنی علم الاشیاء — سائنس کی روح! ہماری سائنس صرف اسی حد تک عربوں کی رہینِ منت نہیں کہ انھوں نے ہمیں عجیب و غریب نظریات و انکشافات سے روشناس کردیا۔ نہیں! بلکہ ہماری سائنس کا وجود ہی ان کا شرمندۂ احسان ہے۔ اسلام سے پہلے کی دنیا درحقیقت زمانہ قبل از سائنس (Pre-scientific) تھا۔ پندرہویں صدی تک یورپ ان ہی علوم و فنون کو اپنا تا رہا جو اسے مسلمانوں نے دیئے تھے۔ اس پر کوئی اضافہ نہ کرسکا۔ . . . . جب اندلس میں تہذیب و ثقافت نے پھر تاریکیوں کی چادر اوڑھ لی تو یورپ میں وہ جن نمودار ہوا جسے اندلس کی سرزمین نے پیدا کیا تھا۔ یورپ کو زندگی (صرف) سائنس نے دی۔ اسلام کے گوناگوں اثرات اس کی حرارت کا موجب بنے۔

(Briffault—The Making of Humanity

*

اور یہ سب قرآن کی بدولت تھا۔

تحقیقِ جدید نے ہمیں اس نتیجہ پر پہنچایا ہے کہ یورپ کے علماء نشاۃ ثانیہ سے پہلے، یونانی فلسفہ، ریاضی، فلکیات اور دیگر علوم کے متعلق جو کچھ جانتے تھے ان کا منبع لاطینی کتابیں تھیں اور ان کا سرچشمہ عربی علوم تھے۔ اور جس قوت نے عربوں کے دل میں ان علوم کا شوق پیدا کیا وہ قرآن تھا۔ نہ صرف فنی علوم ہی بلکہ لسانیات شاعری اور ادب کی دوسری شاخیں بھی قرآن کی اشاعت کے ساتھ ہی نمودار ہوئیں اور اس طرح جس دور کی ابتدا ہوئی اس سے علم و ہنر اور ذہانت و فطانت کے شاندار ثمرات ظہور میں آئے۔ (Margoliouth)

پھر جس طرح اس انقلاب عظیم نے دنیا کو وہ سب کچھ دیا جس پر دنیا آج فخر کر رہی ہے اسی طرح یہ دنیا کو وہ سب کچھ بھی دے سکتا ہے جس کی تلاش میں دنیا آج اس طرح مضطرب و پریشان ماری ماری پھر رہی ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف برنارڈ شا کی زبان سے سنئے۔ وہ کہتا ہے۔

> میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مذہب کو اس کی توانائی کی بنا پر ہمیشہ بنگاہِ احترام دیکھا ہے۔ میرے نزدیک دنیا میں تنہا یہی مذہب ہے جس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دے سکے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کا پیغام ہر زمانہ کے لوگوں کو اپیل کر سکتا ہے۔ میں نے اس حیرت انگیز شخصیت کی سیرت کا مطالعہ کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ مسیح کا نقیض ہونے کی بجائے، بجا طور پر نوعِ انسانی کا نجات دہندہ کہلا سکتا ہے۔ میرا یقین ہے (اگر آج اس جیسا کوئی انسان دنیا کی آمریت سنبھال لے تو وہ اس کے مسائل کا اس خوبی سے حل پیدا کر سکتا ہے کہ یہ دنیا پھر سے امن و مسرت کی زندگی کو پالے جس کی آج اشد ضرورت ہے۔ میں نے یہ پیش گوئی کی ہے کہ جس طرح آج کا یورپ اس مذہب کو قبول کرنے پر آمادہ ہو رہا ہے اسی طرح کل کا یورپ بھی اس مذہب کو قبول کرے گا۔

پوچھئے تاریخ کی رصد گاہوں سے کہ دنیا میں اس قسم کی کامیاب زندگی کسی اور کے حصہ میں بھی آئی ہے؟ اور یہ تمام کامیابی، نہایت سادگی اور متانت کے ساتھ۔

آج جبکہ خود ہمارے عہد کے انسانوں نے ان تمام تفاصیل کو بے نقاب کر دیا ہے جو اس انقلاب آفریں شخصیت کی زندگی سے متعلق ہیں، اس کی ابتدائی اور آخری، ہر دو ادوارِ حیات سے متعلق، اس حقیقت کا کما حقہٗ سمجھنا پھر بھی آسان نہیں ہوا کہ اس عظیم القدر ہستی کا کردار کس قدر بلند اور اس کی محیر العقول کامیابی کا راز کیا تھا۔ اس نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اسے خدائی قوتیں حاصل ہیں۔ اس نے اپنے آپ کو ایک عام انسان اور خدا کے پیغامبر سے زیادہ حیثیت کبھی نہیں دی۔ بایں ہمہ، اس نے اپنی قوم کے ممتاز ترین افراد کو اپنا حلقہ بگوش بنا لیا اور ان پر اپنے کردار کا ایسا گہرا اثر ڈالا کہ نہ اس زمانہ میں جبکہ وہ چاروں طرف سے مصائب و افلاس نے گھیر رکھا تھا اور نہ اس وقت جب وہ ایک عظیم الشان سلطنت کا مالک تھا، اسے اپنی جماعت کے کسی ایک فرد کے خلاف غداری کی شکایت نہیں ہوئی۔ اسے اپنی ذات پر اعتماد اور تصرف خداوندی پر یقین محکم، شکست اور مایوسی کی حالت میں اس سے بھی کہیں زیادہ ہوتا تھا جب وہ فتح و ظفر کے عالم میں دشمنوں پر اپنی شرائط منواتا تھا۔ (اس نے اسی طرح زندگی بسر کی اور اس کے بعد) اپنے دورِ اول کے متبعین، عقیدتمندان اور احباب کے حلقہ میں (نہایت سکون سے) آنکھیں بند کر لیں۔ نہ اس کی زندگی کا کوئی گوشہ زیر نقاب رہا نہ اس کی موت کسی رازداری کی موت ہوئی۔

(M.H. Hyndman, The Awakening of Asia P. 9)

یہی وہ حقائق ہیں جن کے پیشِ نظر انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہو گیا کہ

تمام پیغمبروں اور مذہبی شخصیتوں میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سب سے زیادہ کامیاب ہیں۔

اور جب حقیقت یہ ہے تو پھر وہ اور کونسی شخصیت ہو سکتی ہے جسے مقام محمودیت[1] پر جلوہ فرما ہونے کا حق ۔۔۔۔۔۔

مقام محمودیت

پہنچ سکتا ہے۔ اس میں کسی جذباتی عقیدت کو دخل نہیں بلکہ یہ ایک واقعہ نفس الامری کا اظہار ہے کہ دنیائے انسانیت میں آج جو کچھ قابلِ حمد و ستائش اور درخورِ تحسین و تبریک نظر آتا ہے وہ اسی وجہ سے ہے کہ وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ ایک نسبت رکھتا ہے۔ ذات محمدؐ رسول اللہ سے اور جو انسان چاہتا ہے کہ وہ درخورِ حمد و ستائش ہو جائے وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کوشش میں ہے کہ اس راستہ پر چل نکلے جو سیرت محمدیہ نے دنیا میں متعین کر کے دکھایا۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو — آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہا است — یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

آج محفلِ کائنات میں کوئی شمع جلوہ فگن نہیں جو اس سراجِ منیر سے کسبِ ضیاء نہ کر رہی ہو۔ اس تیرہ سو برس کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے اور پھر دیکھئے کہ دنیا آہستہ آہستہ اسی نظام کی طرف آ رہی ہے یا نہیں جسے محمد رسول اللہ والذین معہٗ نے اس دنیا میں متشکل کر کے دکھایا تھا۔ دیکھئے کہ اس عرصہ میں جس قدر انقلابات دنیا میں آئے اور جنہیں دنیا نے نوعِ انسانی کے لئے موجب خیر و برکت

دنیا کس طرف جا رہی ہے؟

قرار دیا، ان کا سرچشمہ کہاں تھا؟ دنیا نے ملوکیت کو لعنت قرار دیا اور نوعِ انسانی کی حریت اور آزادی کو مطابقِ فطرت سمجھا۔ لیکن غور کیجئے کہ دنیا میں سب سے پہلے ملوکیت کو نظامِ انسانیت کے لئے فسادِ عظیم کس نے قرار دیا اور کس نے انسانیت کو صحیح حریتِ فکر و عمل کا پیغام دیا؟

دنیا نے دینی پیشوائیت (Priesthood) کو انسانی استبداد کا مقدس نقاب بنایا۔ لیکن دیکھئے کہ سب سے پہلے کس نے اس نقاب کی دھجیاں فضائے عالم میں بکھیریں؟ اور کس نے واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی دوسری قوت حائل نہیں ہو سکتی؟

دنیا نے غلامی کو جسدِ انسانیت کے لئے جذام قرار دیا۔ لیکن سوچئے کہ سب سے پہلے کس نے غلامی کو جرمِ عظیم قرار دیا اور ان تمام راہوں کو بند کر دیا جن سے یہ جراثیم داخل ہوا کرتے تھے؟ آج دنیا ذات پات کی تمیز کو انسانیت کی ترقی کی راہ میں سنگِ گراں محسوس کر رہی ہے اور ہندوستان میں ویدوں اور شاستروں کی تعلیم کے علی الرغم اس کے استیصال کی کوششیں جاری ہیں۔ لیکن غور کیجئے کہ دنیا میں سب سے پہلے کس نے یہ اعلان کیا کہ تمام نوعِ انسانی کی تخلیق نفسِ واحدہ سے ہوئی ہے اور پیدائش کے اعتبار سے کسی کو

---

[1] عسیٰ ان یبعثک ربک مقاماً محموداً (۱۷/۷۹) وہ مقام جو حمد و ستائش کے ہر عنوان کا مرجع ہو۔

کسی دوسرے پر کوئی فوقیت یا افضلیت نہیں۔ عزت و تکریم کا معیار انسانی سیرت کی بلندی ہے نسلی تفوق نہیں۔

آج دنیا انسانوں کی جغرافیائی اور نسلی یا لسانی تقسیم (وطنیت۔ نیشنلزم) میں جہنم کی آگ محسوس کر رہی ہے۔ لیکن دیکھئے کہ وہ کون تھا جس نے سب سے پہلے حبش کے غلام اور قریشِ مکہ کے نجیب الطرفین سردار کو ایک قوم کے افراد بنا کر عملاً ان غیر فطری حدود و قیود کو مٹایا!

آج دنیا نوعِ انسانی کی امن و سلامتی کا خواب تمام انسانوں کے لئے ایک نظام کی شکل میں دیکھ رہی ہے لیکن سوچئے کہ وہ کون تھا جس نے سب سے پہلے آواز دی کہ تمام نوعِ انسانی ایک امتِ واحدہ ہے اس لئے اسے ایک ہی نظام کے رشتہ میں منسلک ہونا چاہئے؟

آج دنیا سرمایہ داری کے نظامِ معیشت کو موجودہ عالمگیر مصائب و نوائب کا بنیادی سبب قرار دے رہی ہے۔ لیکن دیکھئے کہ تاریخ انسانیت میں سب سے پہلے اس مردود نظام کے خلاف کس نے صدائے احتجاج بلند کی۔ وہ کون تھا جس نے احتکار و اکتناز کو بہت بڑا جرم قرار دیا۔ زمین پر انفرادی ملکیت کو ناجائز ٹھیرایا۔ دولت کو امراء کے طبقہ میں گردش کرتے رہنے سے روکا اور انسان کی جائز ضروریات کے بعد، جو کچھ باقی بچے اسے نظامِ اجتماعیہ کی امانت قرار دیا۔ اور اس نظام کو ان تمام انسانوں کی معاش کا ذمہ دار ٹھیرایا جو اس کے حلقۂ اثر میں ہوں۔

آج دنیا میں قیامِ امن کا واحد ذریعہ یہی سوچا جا رہا ہے کہ کوئی ایسی جماعت موجود ہونی چاہئے جو اقوامِ عالم کے متنازعہ فیہ معاملات میں حکم کا کام دے اور جس کے فیصلوں سے سرتابی کی مجال کسی کو نہ ہو۔ لیکن تاریخِ انسانی سے پوچھئے کہ وہ کون تھا جس نے سب سے پہلے یہ تخیل دنیا کو دیا اور ایک "اُمتِ وسطیٰ" کو نوعِ انسانی کے لئے امن و مسرت کا ضامن ٹھیرایا؟

آج استقرائی علم کو نوعِ انسانی کے لئے احسانِ عظیم تصور کیا جاتا ہے کہ سائنس کے یہ تمام انکشافات و اختراعات اور علوم انسان کے دیگر شعبوں میں سب فروغ و ارتفاع اسی کا رہینِ کرم ہے لیکن پوچھئے اربابِ علم و فن سے کہ ذہنِ انسانی کو سب سے پہلے استقرائی علم سے کس نے روشناس کرایا اور کس نے عملاً رائج کیا؟

عائلی زندگی میں آج طبقۂ نسواں کے حقوق و واجبات پر اس قدر زور دیا جا رہا ہے لیکن سوچئے کہ وہ کون تھا جس نے سب سے پہلے ان کے اخلاق و واجبات کی طرف دنیا کو متوجہ کیا اور انھیں صنفِ زندگی میں مردوں کے دوش بدوش لا کھڑا کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان ہر دو اصناف کے فطری وظائفِ حیات کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیا۔

آپ ان سوالات کو ایک ایک کر کے سامنے لائیے اور پھر عقیدتمندانہ نگاہ سے نہیں بلکہ خالصتہً غیر جانبدارانہ انداز سے خالی الذہن ہو کر تاریخ کا مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ انسان کی داخلی اور خارجی دنیا میں جس قدر ایسے انقلابات آئے ہیں جن کے نتائج

تعمیر انسانیت کے لئے ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں کیا ان کا سرچشمہ وہی تعلیم نہیں جو محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تیرہ سو سال پہلے دنیا کو دی تھی اور جو آج تک دنیا میں محفوظ چلی آرہی ہے! یہ ایک خالص علمی سوال ہے۔ علمی انداز سے اس کا جواب مرتب کیجئے اور پھر دیکھئے کہ آپ کس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ آپ جب اس نگاہ سے رسالت محمدیہ کا مطالعہ کریں گے تو آپ پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جائیگی

حدِ فاصل کہ یہ رسالت نوعِ انسانی کی تاریخ میں ایک حدِ فاصل ہے جو اپنے سے پہلے اور بعد کے زمانہ میں نمایاں امتیاز قائم کرنے کے لئے کھڑی ہے۔ اس رسالت سے نوعِ انسانی کو ایک نیا پیغام ملا جس نے شرفِ انسانیت کی تمام راہوں کو ایک ایک کر کے کھول دیا۔ یہ وہ پیغام ہے جو ضمیرِ انسانی کی انتہائی گہرائیوں سے ابھرتا ہے اور اس کی فطرتِ سعیدہ کی ترجمانی کرتا ہے اسی لئے یہ کبھی پرانا نہیں ہو سکتا۔

صد جہانِ تازہ در آیات اوست — عصرہا پیچیدہ در آنات اوست
بندۂ مومن ز آیات خدا ست — ہر جہاں اندر برِ او چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش — می دہد قرآں جہانے دیگرش

اب دنیا کو نہ کسی نئے آئین کی ضرورت ہے نہ کسی دوسرے آئین لانے والے (رسول) کی۔ نوعِ انسانی کی تمام مشکلات کا حل اسی آئین کے اتباع میں ہے کہ سفرِ زندگی میں یہ آئین اس راہ کی طرف راہ نمائی کرتا ہے جو سب سے سیدھی اور محکم راہ ہے۔ ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم

اور گوئٹے کے الفاظ میں

اسلام کی تعلیم کسی مقام پر بھی ناکام ثابت نہیں ہو سکتی۔ ہم اپنے تمام نظامہائے تمدن کے باوجود اس کی حدود سے آگے نہیں جا سکتے اور حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی انسان بھی اس سے آگے نہیں جا سکتا۔

(Goethe to Eckermann)

ہمارا جدید ترین اور بلند پایہ علمی لٹریچر

(۱) منشور متحدہ اقوام دیگر بین الاقوامی دساتیر و دستاویزات

یہ کتاب بین الاقوامی اداروں کے قوانین و دستور العمل کا گنجینہ اور گذشتہ دس سالہ بین الاقوامی معاہدات کا بہترین مجموعہ ہے۔ اس کا مطالعہ اخباری خبروں کو سمجھنے اور واقعات عالم کے مطالعے کے لئے ضروری ہے۔ یہ خلاصہ نہیں بلکہ مکمل ترجمہ ہے جس میں میثاق مجلس اقوام، بین الاقوامی عدالت، انصاف، بین الاقوامی عمالی تنظیم، بین الاقوامی بنک برائے تعمیر نو، منشور اٹلانٹک، میثاق اٹلانٹک کے علاوہ دیگر اعلانات و قوانین شریک ہیں۔

ترجمہ۔ احمد عبداللہ المدوسی بی اے۔ ال ال بی (ایڈوکیٹ) قیمت پانچ روپے آٹھ آنے

(۲) پاکستان کا معاشی جائزہ

یہ کتاب بین الاقوامی اسلامی اقتصادی کانفرنس کی مرتبہ ہے جس کا نہایت معیاری ترجمہ مولوی محمد بن علی صاحب بی۔ اے نے کیا ہے۔ یہ پاکستان کے قدرتی وسائل اور معاشی حالات کا کھلا آئینہ ہے۔ اس موضوع پر یہ پہلی مستند و جامع ترین کتاب ہے۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے۔

(۳) مشرق وسطی کا معاشی جائزہ

مشرق وسطی کے ممالک، تاریخ کے ایک بہت بڑے دور میں دنیا کی قیادت کے حامل رہے ہیں اور آج بھی عیسائیت، یہودیت اور اسلام کے مشترکہ قبلہ کی حیثیت سے یہ دنیا کے ممالک کی اکثریت کا روحانی مرکز ہیں۔ ان ممالک کے معاشی حالات پر یہ پہلی مستند کتاب بین الاقوامی اسلامی اقتصادی کانفرنس نے مرتب کی ہے جس کا معیاری ترجمہ علی یزدانی صاحب بی۔ اے نے کیا ہے۔ قیمت تین روپے۔

(۴) عربی ایڈیشن

یہ مشرق وسطی کے معاشی جائزہ کا عربی ایڈیشن ہے تاکہ عالم عربی اس سے مستفید ہو جس کا ترجمہ با محاورہ اور فصیح عربی کا ایک مکمل نمونہ ہے۔ ترجمہ مولانا ناظم ندوی۔ قیمت پانچ روپے۔

(۵) محمد بن عبدالوہاب

بارہویں صدی ہجری کے مشہور مصلح شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب کے حالات اور ان کی تحریک سے متعلق مفصل حالات اور ان تمام غلط بیانیوں کی تحقیق مشرقی و مغربی ماخذ کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے۔ عمدہ کتابت، اعلیٰ کاغذ اور تصحیح کے ساتھ نیا ایڈیشن پیش ہے۔ مصنف مولانا مسعود علی ندوی۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ۔ مکتبہ خدام ملت۔ اے۔ ایم ۴ فریر روڈ۔ کراچی (پاکستان)

آپ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے

اس لئے ایسے قیمتی لمحات کو ضائع نہ کیجئے۔ ذرا سوچئے کہ اگر آپ کو ضروریات کی دس متفرق چیزیں خریدنی ہوں تو ان کی تلاش میں آپ کا کس قدر وقت صرف ہوگا اور پریشانی کتنی اٹھانی پڑے گی۔ لیکن اگر یہ تمام چیزیں آپ کو

ایک ہی جگہ مل جائیں

مال بھی بہترین ہو اور قیمتیں نہایت واجبی۔ تو آپ کا کسقدر قیمتی وقت اور پریشانی بچ جائے گی۔

ہمارے ہاں

ہوزری کا ہر قسم کا انگلش اور جاپانی مال۔ قسم قسم کا ٹائیلٹ کا سامان۔ سٹیریز (بساط خانہ کی چھوٹی موٹی تمام چیزیں) سائیکل۔ بسکٹ۔ انگریزی مٹھائی۔ وغیرہ ہول سیل نرخوں پر فروخت ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ تشریف لائیے۔ دیکھئے آپ کو کسقدر اطمینان حاصل ہوتا ہے

احمد اینڈ احمد کمپنی۔ سرائے روڈ (نزد سندھ مدرسہ) کراچی ۲

نقد و نظر

ذیل کی چھ کتابیں جن پر تبصرہ کیا جارہا ہے، کتاب منزل لاہور کی طرف سے شائع ہوئی ہیں اور انہی کے ہاں سے مل سکتی ہیں۔

۱۔ اسلام کے عالمگیر اصول

مصر کے مشہور مصنف علامہ فرید وجدی کی کتاب "الاسلام دین عام خالد" کا اردو ترجمہ۔ یہ کتاب چند مقالات پر مشتمل ہے جن میں وجدی صاحب نے حقانیتِ اسلام کے اثبات میں دلائل و براہین سے بحث کی ہے۔ یہ مقالات آج سے قریب بیس سال پہلے لکھے گئے تھے اس لئے ان میں انہی موضوعات سے بحث کی گئی ہے جو اس وقت بالعموم اہمیت اختیار کئے ہوئے تھے۔ گذشتہ جنگِ عظیم کے بعد دنیا کے سامنے اور قسم کے مسائل آگئے ہیں اسلئے اب اسلام کی حقانیت کے لئے یہ بتانا ضروری ہوگا کہ اسلام ان مسائل کا کیا عملی حل تجویز کرتا ہے۔ بایں ہمہ جن مسائل پر وجدی صاحب نے بحث کی ہے ان میں انداز مکابانہ نہیں۔ البتہ جہاں جہاں قرآن کو چھوڑ کر تقلید کا اثر غالب آگیا ہے وہاں علامہ صاحب نے بری طرح سے ٹھوکر کھائی ہے۔ مثلاً وہ زنا کی سزا رجم (سنگساری) بتاتے ہیں اور پھر اس کے مصالح بیان کرتے ہیں۔ جرم زنا کے اثبات کیلئے چار عینی گواہوں کی شرط پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ زنا کے لئے عینی شاہد، شاید ہی کہیں مل سکے، اور وہ بھی پھر ایک نہیں چار۔ (قرآن نے زنا کیلئے نہیں بلکہ فحش یعنی مبادیٔ زنا کے لئے چار شاہدوں کی شرط عائد کی ہے)۔ اسی طرح یہ غلامی کو بھی جائز قرار دیتے ہیں اور پھر اس حسنِ سلوک کی بنا پر جو غلاموں سے کیا جاتا ہے، اسے غلاموں پر احسانِ عظیم بتاتے ہیں۔ اس روایتی تقلید کا برا ہو، کس طرح اچھے سے اچھے سمجھدار انسان کی مت ماردیتی ہے۔ کتاب کی ضخامت ۲۶۴ صفحات ہے۔ تقطیع چھوٹی۔ قیمت تین روپے۔

۲۔ اسلام کا نظریۂ جہاد
۳۔ اسلامی نظریۂ سیاست

یہ دونوں کتابیں حکیم حیدر زماں صدیقی کی تصنیف ہیں۔ حکیم صاحب کے مضامین طلوعِ اسلام میں شائع ہوتے رہتے ہیں اس لئے قارئین طلوعِ اسلام ان کے اندازِ فکر اور اسلوبِ نگارش سے واقف ہیں۔ کتابیں چھوٹی تقطیع کے قریب دو دو سو صفحات پر مشتمل ہیں۔ قیمت دو روپیہ فی جلد

۴۔ اسلام میں امامت کا تصور

علامہ اقبالؒ کے کلام کے صدقے جن الفاظ کو عام شہرت حاصل ہوئی ہے ان میں امامت کا لفظ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب کی جاذبیت اسی لفظ کی شہرت و اہمیت سے ہے۔ اس میں امامت کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک امامتِ کبریٰ یعنی لیڈری، اور دوسری امامتِ صغریٰ، یعنی مسجد کی امامت۔

وہی پرانا تصور کہ لیڈری دنیا سے متعلق ہے اور مساجد کی امامت دین سے۔ پھر بتایا گیا ہے کہ مسجد کے امام میں کیا کیا باتیں ہونی چاہئیں۔ مسجد کے اماموں کے سلسلہ میں امام ابو حنیفہ کے حسن اخلاق کو بھی بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے، گویا وہ بھی کسی مسجد کے امام تھے۔ اسی طرح اقبال کے وہ تمام اشعار جن میں امام یا امامت کے لفظ آتے ہیں، سب اس کتاب میں جا و بیجا جمع کر دیئے گئے ہیں۔ مولوی بدرالدین صاحب بدر جالندھری اس کتاب کے مصنف ہیں ضخامت ۱۳۶ صفحات۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

۵۔ خطباتِ بدر یہ مولوی بدرالدین صاحب کے خطبات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے "زمانہ حاضرہ کے مسلمانوں کی دینی، دنیوی، انفرادی، اجتماعی، علمی، ادبی، اخلاقی، روحانی، سیاسی، اقتصادی" اصلاح کے لئے جمعات و عیدین کے لئے لکھے ہیں ضخامت قریب ساڑھے پانچ سو صفحات۔ قیمت ساڑھے چار روپیہ۔

وہی پرانے وقتوں کے "بارہ ماسی" خطبے جنہیں نول کشور جانی کاغذوں پر چھاپ کر چھ چھ آنے میں فروخت کیا کرتا تھا، اب گرد پوش جلدوں میں چار چار پانچ پانچ روپے میں بکتے ہیں۔ وہی روح، بس قالب دوسرا ہے۔ مثلاً — "شعبان المعظم کا مقدس و متبرک مہینہ ہی پیغام لیکر آیا ہے کہ گنہگار و آخرت کی نعمتیں، سعادتیں، لذتیں اور راحتیں حاصل کرنے اور دنیوی آفتیں اور کلفتیں دور کرنے اور دلی مرادات بر آنے کا سنہری موقع آگیا ہے۔ اگر ایمان اور ایمانی دعاؤں کی تاثیر پر صحیح ایمان رکھتے ہو تو کامل تقویٰ و طہارت کامل یقین و توجہ اور کامل ہمت و تضرع کے ساتھ خدا کی طرف رجوع کرو۔ اپنے روٹھے ہوئے خدا کو منالو۔ اپنے ٹوٹے ہوئے تعلق کو استوار کرلو۔ اپنی روحوں کو میلا اور دلوں کو صاف کرلو ...... شعبان اعظم کا مہینہ وہ مقدس مہینہ ہے جس کے متعلق حضور نبی کریمؐ نے فرمایا ہے کہ شعبان شہری و رمضان شہر اللہ۔ شعبان میرا مہینہ ہے اور رمضان اللہ تعالیٰ کا"

اس قوم کو دنیا میں کون بچا سکتا ہے جس کے خطیب ایسے ہوں!

۶۔ جہانِ نو ڈاکٹر غلام جیلانی صاحب برقؔ نے اپنی پہلی تصنیف کے نام میں ایک جدت برتی تھی، اس لئے جو شخص بھی "دو قرآن" کا نام سنتا تھا، حیرت سے اس کی طرف لپکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اب اپنے بعض مضامین کا مجموعہ شائع کیا ہے جس کا نام "جہانِ نو" رکھا گیا ہے۔ (قیمت دو روپے آٹھ آنے)

ہمیں بالکل معلوم نہیں ہو سکا کہ ان مضامین کو اس نام سے کیا مناسبت ہے۔ ان مضامین میں بعض باتیں کام کی بھی ہیں لیکن بعض ایسی بھی جنہیں دیکھکر حیرت بھی ہوتی ہے اور تاسف بھی۔ مثلاً ڈاکٹر صاحب اس پر بڑا زور دیتے ہیں کہ کسی مذہب کی کتاب کے متعلق یہ نہ کہو کہ وہ گھٹیا ہے یا غیر مکمل۔ انہیں غلط اور محرف نہ قرار دو۔ یہ مدعی سست اور گواہ چست کی بڑی عمدہ مثال ہے۔ سابقہ مذاہب میں سے کوئی مذہب ایسا نہیں جس کے پیرو خود اپنی کتابوں کو محرف نہ قرار دیتے ہوں لیکن ڈاکٹر صاحب ان کی وکالت کے لئے کھڑے ہو رہے ہیں۔ یا مثلاً وہ روایات کو ظنی قرار دیتے ہیں اور ناقابلِ اعتماد۔ لیکن اپنی کتاب میں خود انہی روایات سے ایسے ایسے واقعات لکھتے ہیں جن پر عقل ماتم کرے

اور علم ہنسے۔ مثلاً۔ آپ "راست گوئی" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں۔

"آج سچائی عنقا ہو گئی ہے لیکن ہمارے اسلاف بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ جب سرورِ کائنات مکہ سے نکلے تو کفار نے حضور کی گرفتاری یا قتل کے لئے بھاری انعام مقرر کیا۔ ایک دن ایک مسلح کافر سامنے آ گیا۔ وہ حضرت ابوبکرؓ کو جانتا تھا لیکن رسولِ کریمؐ سے ناواقف تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کسی حالت میں بھی جھوٹ نہیں بولتے۔ چنانچہ اس نے حضرت ابوبکرؓ سے پوچھا من ھذا (یہ تمہارے ساتھ کون ہے) حضرت ابوبکرؓ بڑی مشکل میں پھنس گئے۔ جھوٹ کہیں تو آن جاتی ہے، اور سچ بولیں تو جان۔ اس لئے آپ نے ایسا جواب دیا کہ آن اور جان دونوں بچ گئے۔ فرمایا "رجل یھدینی السبیل"۔ (یہ ایک ایسا آدمی ہے جو مجھے راستہ دکھا رہا ہے)۔ نبی سے بڑھ کر راستہ دکھانے والا اور کون ہوتا ہے؟"

ملاحظہ فرمائی آپ نے راست گوئی کی مثال! انہی حضرت ابوبکرؓ کے متعلق آگے چل کر لکھتے ہیں:- "حضرت ابوبکرؓ کو زبان پر پورا قابو حاصل نہیں تھا۔ جب کبھی کوئی ناگوار بات نکل جاتی تو پہروں پشیمان رہتے۔ ایک مرتبہ زبان کو پکڑ کر توڑ مروڑ رہے تھے کہ اوپر سے حضرت عمرؓ آ گئے۔ پوچھا۔ ابوبکر یہ کیا کر رہے ہو؟ اس حرکت سے باز آؤ۔ فرمانے لگے مجھے اس کی خبر لینے دو کہ اسی نے تو مجھے تباہ کیا ہے" (موطا امام مالکؒ) کچھ سمجھے آپ؟

ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔ عنوان ہے "والدین سے محبت"۔ اور بیان ہے:- "حضرت علیؓ کے انتقال کے بعد حضرت امام حسنؓ خلیفہ بنے تو آپ کی زوجۂ محترمہ جنابِ عائشہ نے کہا "خلافت مبارک ہو" آپ کی آنکھیں غصہ سے سرخ ہو گئیں۔ اور برہم ہو کر فرمایا کہ تم مجھے میرے والدِ محترم قبلہ کی وفات پر مبارکباد دیتی ہو۔ دور ہو جاؤ میری آنکھوں سے۔ اور ساتھ ہی طلاق دیدی"۔

یہ ہے اڑھائی سو صفحات کی وہ کتاب جس کا نام ہے "جہانِ نو" اور جس کے مصنف ہیں ڈاکٹر غلام جیلانی صاحب برق۔ ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی۔

۷۔ حیاتِ نبیؐ

عبدالحئی صاحب، حکومتِ ہند کے ایک ریٹائرڈ اہل کار ہیں۔ انھوں نے محبت اور خلوص سے "سیرت نبی اکرمؐ" عام فہم انداز میں لکھی ہے۔ واقعات بالعموم علامہ شبلی مرحوم کی سیرت سے ماخوذ ہیں۔ کتاب چھوٹی تقطیع کے ۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت بلا جلد ۸/ مولف سے ۱۲/ حسینہ منزل۔ پرنس روڈ کراچی سے مل سکتی ہے۔

۸۔ ہومیو ڈاکٹر

ہومیو پیتھی کے متعلق ماہوار رسالہ جو ڈاکٹر محمد اسمٰعیل صاحب نامی کی زیرِ ادارت، حیدر آباد (سندھ) سے شائع ہوتا ہے۔ پاکستان میں ہومیو پیتھک طریقِ علاج کی ترویج، رفاہِ عامہ کے لئے نہایت ضروری ہے اس لئے اس سائنس کی اشاعت کے متعلق ہر صحیح کوشش مستحسن ہے۔ ان کوششوں کی بارآوری میں تعاون، عمدہ نتائج کا حامل ہو سکتا ہے۔ سالانہ چندہ للعہ فی پرچہ ۶/

۹۔ البیان

امرتسر (مرحوم) کی امتِ مسلمہ کا ماہوار صحیفہ "البیان" تقسیمِ ہند کے عواقب کی نذر ہو گیا تھا۔ اب محترم عرشی صاحب کی سعی و کاوش سے لاہور سے دوبارہ جاری ہوا ہے۔ "البیان" قرآنی تعلیم کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے اور جس طرح

اس کے دورِ اول میں محترم عرشی صاحب کی سادگی اور فروتنی اس کے ورق ورق سے ٹپکا کرتی تھی۔ اب بھی یہ مجلہ اسی مخلصانہ عجز و دیانت کا آئینہ دار ہے۔ ہمیں امید ہے کہ عرشی صاحب کی کشش اپنے دیرینہ احباب کو پھر سے البیان کی محفل میں کھینچ لائے گی اور اس طرح ان کی "جگر لخت لخت" جمع کرنے کی کاوش "دعوتِ مژگاں" کا سامان بہم پہنچا دے گی۔ طلوعِ اسلام کی یہ مخلصانہ آرزوئیں ان کے شریکِ حال ہیں۔

البیان کا سالانہ چندہ پانچ روپیہ ہے اور ایک پرچہ کی قیمت ۸ ؍ ۔ پتہ ۔ ادارۂ البیان، دار القرآن۔ نسبت روڈ۔ لاہور۔

۱۰۔ چبھے ہوئے کانٹے وہ کونسا حساس دل ہے جو مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ پر تجسسانہ نگاہ ڈالے اور مختلف نوعیتوں کے کانٹوں سے چھلنی نہ ہو جائے۔ محترم حکیم ابوالنظر صاحب امروہوی، فطرت کی طرف سے ایک ایسا ہی حساس قلب اور متجسسانہ نگاہ لے کر آئے ہیں۔ اس نگاہ سے جب مسلمانوں کی حالت پر غور کیا تو دل کانٹوں سے چھد گیا۔ کانٹوں کی ٹیس، لب پر تیز نشتر بن کر آگئی۔ انہی کا پیکر یہ چھوٹا سا پمفلٹ ہے جسے اقبال اکیڈمی لاہور نے شائع کیا ہے۔ قیمت چھ آنے۔

ان تلخ و تیز حقیقتوں کو حکیم صاحب نے قوم کے مزعومہ "مذہبی مفکرین" کے سامنے پیش کیا ہے اور ان سے ان کا اطمینان بخش جواب مانگا ہے۔ لیکن ہم حکیم صاحب سے عرض کریں گے کہ جب وہ خود بھی جانتے ہیں کہ ان مدعیانِ چارہ سازی کا یہ عالم ہے کہ ان کی ہر سعیٔ مداوا کے بعد مریض پر چیخ اٹھتا ہے کہ

خواستم پیکاں برآرم ، در جگر نشتر شکست

تو ان سے ان چبھے ہوئے کانٹوں کے نکالدینے کی توقع رکھنا عبث ہے۔ بہتر ہو کہ وہ اس کے بعد خود ہی بتا دیں کہ ان کے نزدیک ان کانٹوں کے نکلنے کی کیا تدبیر ہے۔ کانٹوں کی چبھن تو اب بہت سے دل محسوس کر رہے ہیں۔ بالآخر ان کے نکلنے کی کوئی صورت بھی تو سامنے آئے؟

کچھ ہوش میں آنے کی میرے شکل ہے ناصح یہ میں بھی سمجھتا ہوں مجھے ہوش نہیں ہے

حکیم صاحب کی تحریر پر نظر میں بعض لوگوں کو شاید بے ربطی اور پریشانی نظر آئے لیکن شدتِ درد میں ربط و نظم کا کسے ہوش ہوتا ہے۔ بقول غالب

نالہ پابند سنے نہیں ہے فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے

۱۱۔ معاشی جائزے گذشتہ صدی کو اگر مشینوں کا دور کہا جا سکتا ہے تو موجودہ صدی دورِ معاشیات ہے۔ اسی معاشی اثر کا نتیجہ تھا کہ مطالبۂ پاکستان پر مخالفین پاکستان کا سب سے بڑا اعتراض یہی ہوا کرتا تھا کہ پاکستان معاشی اعتبار سے ناقابلِ عمل ہے۔ معاشیات میں اعداد و شمار کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ جو قومیں اعداد و شمار سے غفلت برتتی ہیں ان کی مثال ان دوکانداروں کی سی ہے جو آمد و خرچ کا کوئی گوشوارہ تیار نہیں کرتے اور انہیں یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ان کی دکانوں سے کیا آمدنی ہو رہی ہے اور جو پیسہ باہر سے آتا ہے وہ کہاں خرچ ہو رہا ہے۔ مسلمان زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح معاشیات میں بھی پسماندہ رہے ہیں۔ قیامِ پاکستان نے انہیں ان تقاضوں سے روشناس کرا دیا ہے جن سے وہ اب تک اعراض برتتے رہے ہیں۔ کراچی کی بین الاقوامی اقتصادی کانفرنس

اسی معاشی شعور کا عملی مظہر ہے۔ بلادِ اسلامیہ کی یہ پہلی کانفرنس ظاہر ہے کہ اسقام و نقائص سے خاطر خواہ طور پر مبرا نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کی کامیابی کا مدار اس کی کارگزاری نہیں بلکہ اس کا سطلق انعقاد ہے۔ مسلمان کا اپنی توجہ کو معاشیات کی طرف منعطف کرنا دلیل ہے اس حقیقت کی کہ وہ عہدِ حاضر کے تقاضوں کو محسوس کر رہا ہے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کا متمنی ہے۔

اس کانفرنس نے دیگر مطبوعات کے علاوہ پاکستان اور مشرق وسطیٰ کے علیحدہ علیحدہ جائزے بزبانِ انگریزی شائع کئے ہیں۔ ان دونوں جائزوں کے اردو تراجم مکتبہ خدام ملت کراچی کی طرف سے شائع ہوئے ہیں۔ یہ جائزے سیر حاصل اور مکمل نہیں لیکن اس خوبی کے حامل ضرور ہیں کہ ان میں ممالک اسلامیہ سے متعلق ضروری اعداد و شمار اور تجارتی کوائف مندرج ہیں۔ اعداد بعض جگہ پرانے بھی ہیں۔ اس کی وجہ غالباً مرتبین کا تساہل نہیں بلکہ یہ حقیقت کہ بعض ممالک میں تازہ ترین اعداد موجود نہیں۔ ہمیں اس وقت ان مجموعات کے اسقام سے بحث نہیں . . . .

بہر کیف یہ پہلی کوششیں ہیں اور اس اعتبار سے قابلِ احترام و خوش آئند۔ انھیں بہتر بنایا جا سکتا ہے اور ہمیں توقع ہے کہ کانفرنس آئندہ ادھر زیادہ توجہ صرف کرے گی۔

مشرق وسطیٰ کے معاشی جائزے میں انڈونیشیا کو بھی "مماثل حالات" کی وجہ سے شامل کر لیا گیا ہے۔

پاکستان کے معاشی جائزے کی قیمت چار روپے ہے اور مشرق وسطیٰ کے معاشی جائزے کی قیمت تین روپے۔ دونوں کتابیں مجلد ہیں اور سفید اخباری کاغذ پر چھاپی گئی ہیں۔ چونکہ دونوں کتابیں انگریزی اصل کا ترجمہ ہیں اور ان میں طبعزاد تحریر کی ذہنی کاوش شامل نہیں، اس لئے ان کی قیمتیں کم ہونی چاہئیں تھیں۔

پاکستان پس منظر و پیش منظر

مصنفہ حمید انور، شائع کردہ، اشاعت منزل، بل روڈ۔ لاہور۔ قیمت تین روپے

جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے، مصنف نے کتاب کو "پس منظر" اور "پیش منظر" کے دو علیحدہ عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔ عنوان اول کتاب کے ۳۰۴ صفحات میں سے ۲۰۹ کو محیط ہے۔ یہ حصہ بقول مصنف "پوری ہندو انسائیکلو پیڈیا" ہے اور اس کا مقصد یہ بتانا ہے کہ

> قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہندو کو سمجھو، ہندو کی چھان بین کرو، ہندو کی راکھ کریدو، ہندو فطرت کا مطالعہ کرو، ہندو تاریخ کی تفتیش کرو اور پھر اس مرض کے پکے ہوئے ناسور کو جہاں پاؤ بے دریغ اس پر نشتر رکھ دو۔

مصنف نے ہندو فطرت کا مطالعہ البیرونی، بیورلی نکلس، خالدہ ادیب خانم اور راجندر کرکے آئینوں میں کیا ہے اور عنوان اول کے ۲۰۹ صفحات میں سے ۹۴ صفحات کو بیشتر انہی حضرات کے اقتباسات سے پُر کیا ہے۔ اس کے بعد گو مصنف نے سابقہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاست کا بھی جائزہ لیا ہے لیکن ہندو ذہنیت کے تجزیہ میں وہ اس حد تک منہمک ہیں کہ ملی سیاست کے اس اہم پیش نظر پہلو خاطر

نگاہ ڈالنے کی صرف قلیل سی فرصت نکال سکے ہیں۔ چنانچہ یہ تبصرہ اس قدر سرسری ہے کہ اگر اسے حذف کر دیا جائے تو کوئی خلا نظر نہ آئے۔

اس حصہ میں صاحبِ کتاب نے دوسروں کے حوالے دے دے کر ہندو فطرت کی عقربیت اور سمیت کو اجاگر کیا ہے، اور اسے دنیائے اسلام کا واحد خطرہ قرار دیا ہے۔ آگے چل کر دوسرے حصہ میں گو مصنف نے عنانِ قلم کو ادھر موڑا ہے کہ پاکستان کا مطالبہ اسلامی حکومت کے قیام کی غرض سے کیا گیا تھا اور ایسا ہی ہونا بھی چاہئے تھا لیکن حصہ اول کے صفحے صفحے سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے ہندو سے بچنے کے لئے پاکستان قائم کیا اور اب اسی کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے انہیں اس کا تحفظ کرنا چاہئے ہندو ناسور پر جراحت کا "دلیرانہ عمل" کرتے وقت مصنف خود بھی ناسوری مواد میں لتھ پتھ ہو گیا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندو قوم مثبت اساسات قومیت سے تہی دامن ہے۔ اس کی حکمتِ عملی کی اساس ہمیشہ منفیانہ رہی۔ منفی اساس کسی مثبت شے کی مخالفت ——— نفرت ——— سے پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو میں جذباتِ نفرت کا ہجوم ہوتا ہے۔ مسلمان اس معاملہ میں بڑا خوش قسمت ہے۔ قرآن نے اس کا دامن مثبت اساسات اور مستقل اقدار سے مالامال کر دیا ہے۔ وہ اساسات و اقدار از خود قائم ہیں، عام اس سے کہ ہندو یا کوئی بھی اور مخالف گروہ اس کا حریف نہ ہو۔ قیامِ پاکستان کا مطالبہ انہی مثبت اساسات پر استوار تھا اور اس لئے استحکامِ پاکستان بھی انہی مستقل بنیادوں پر ہو گا، لہٰذا مسلمان کی سیاست کا رخ کسی قوم کی نفرت کی منفی اساس کی طرف منعطف کرنا مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا۔

پس منظر کو عبور کر کے پیش منظر کی وادی میں داخل ہوتے ہوئے مصنف نے آئندہ نسلوں سے بھی خطاب کیا ہے اور یوں اپنی برأت کا اعلان کیا ہے:

> ہم نے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی پوری قیمت ادا کر دی ہے اور اپنے گناہوں کے بار کو کسی کندھے کے لئے باقی نہیں چھوڑا . . . . . . اس لئے ہمیں تضحیک و ملامت کا سزاوار قرار نہ دیا جائے۔

انسانی اجتماع کا کوئی مبصر اتنا بڑا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ کون ایسے اسلاف تھے جن کے اعمال کا بوجھ اخلاف کے کندھوں پر نہیں پڑا۔ مکافاتِ عمل کا قانون ایسا عجلت پذیر نہیں کہ وہ کسی ایک نسل کے اعمال کے نتائج اس نسل کے سامنے ظہور میں لے آئے۔ یہاں جس طرح بیٹا باپ کے ترکہ کا وارث ہوتا ہے اسی طرح وہ بیٹا اس کے قرضہ کا بھی ذمہ دار ہوتا ہے۔ چنانچہ خود ہماری قومی زندگی اس امر کی زندہ شہادت ہے کہ ہمارے بیشتر مصائب کا سرچشمہ ماضی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اخلاف نے بھی اس وزن میں اضافہ کیا لیکن اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ آبائی بوجھ سے ان کے کندھے سبکدوش نہیں رہ سکے۔ ہمارے اعمال کے نتائج میں ہماری آئندہ نسلیں ضرور شریک ہوں گی۔ ہم اس ذمہ داری سے بری نہیں ہو سکتے!

پس منظر میں مصنف نے "مثالی ریاست کی تاسیس" اور اس کی تفصیلات، "آزاد معاشرے کی تعمیر" اور اس کی جزئیات اور

پاکستان کی خارجہ حکمت عملی ایسے موضوعات کو چھیڑا ہے۔ ان چند صفحات میں آپ نے اتنے موضوعات کو اکٹھا کر دیا ہے کہ ہر موضوع تشنہ رہ گیا ہے اور جگہ جگہ انداز نظر و بحث تصنیفی متانت و ثقاہت سے اتر کر صحافیانہ سطحیت پر آگیا ہے۔ مصنف نے کئی جگہ عام مولویانہ اعتقادات کی مخالفت کی ہے اور ان سے ہٹ کر بات کرنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ خود قرآن کو سنت کے مولویانہ "رفیق" سے علیحدہ نہیں رکھ سکے۔

اگر ہونہار مصنف نے زیرِ بحث موضوعات کی غیر معمولی سنجیدگی کا مناسب احترام کیا ہوتا تو ان کی پیشکش علمی حلقہ میں زیادہ احترام کے ساتھ دیکھے جانے کی مستحق ہو سکتی تھی۔

ہر قسم کے امراض کے تسلی بخش علاج

کیلئے

ڈاکٹر عبد الحمید (ہومیوپیتھ)

سے رجوع کیجئے

جو قابلیت، تجربہ، تشخیص اور علاج

میں

پاکستان بھر میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔

جنرل ہومیو سٹور۔ آرام باغ روڈ۔ کراچی

لیجئے! بتوفیق ایزدی

معراجِ انسانیت

نہایت آب وتاب سے شائع ہوگئی۔ ترجمانِ حقیقت، جناب پرویز کا قلم، اور سیرتِ صاحبِ قرآن علیہ التحیہ والسلام، خود قرآن کے آئینہ میں۔ فی الحقیقت ہمارے اسلامی لٹریچر میں، اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔ شروع میں قریب پونے دوسو صفحات میں دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر ہے۔ اس میں بعض ایسے مذاہب کا بھی تذکرہ ہے جن کا شاید نام بھی آپ نے پہلے نہ سُنا ہوگا۔ پھر، نادر عنوانات کے ماتحت سیرت حضور سرورِ کائنات جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ اصل کتاب بڑے سائز کے ۸۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ مقدمہ وغیرہ کے ابتدائی پچاس صفحات اس سے الگ ہیں۔

کاغذ اعلیٰ درجہ کا ولایتی گلیزڈ۔ جلد مضبوط اور حسین۔ گردپوش مرصع اور دیدہ زیب ٹائیٹل اور صبح بہار کے عنوانات منقش اور رنگین۔

قیمت بیس روپے۔ محصولڈاک اور پیکنگ اڑھائی روپیہ۔

یہ کتاب سلسلہ معارف القرآن کی چوتھی جلد ہے۔ پہلی تین جلدیں تھوڑی سی تعداد میں باقی ہیں تینوں جلدوں کی قیمت /35 روپے۔ پورا سیٹ بذریعہ ریل منگانے سے فائدہ رہے گا۔

ادارۂ طلوعِ اسلام

رابسن روڈ۔ کراچی

۱۹۴۹

کشمیر گذشتہ سال کا آغاز اس مژدۂ جانفزا سے ہوا کہ ہندوستان اور پاکستان نے جنگِ کشمیر بند کر دی ہے۔ کشمیر کا مسئلہ کوئی سال بھر سے اقوامِ متحدہ کے روبرو پیش تھا، اور جس سہل انگاری اور سست رفتاری سے اس کا حل تلاش کیا جا رہا تھا اس کے پیشِ نظر تصفیہ کی توقعات چنداں وقیع نہیں رہی تھیں۔ تاہم اعلانِ التوائے جنگ نے پھر سے توقعات کو ابھارا اور کشمیر کمیشن کے اس سال نو کے تحفہ کو غنیمت جانا گیا۔ مذکورہ اعلان کے نوزا بعد استصواب کشمیر کے اوقات نامہ سے متعلق تشریحی تجاویز بھی شائع کر دی گئیں۔ استصواب کا پہلا مرحلہ التوائے جنگ اور اس سے متعلقہ حدود کا مناسب ردوبدل کے بعد تعین تھا۔ دوسرا مرحلہ متارکہ کا تھا۔ اس میں ریاست کو غیر ضروری بیرونی افواج سے خالی کرا کے استصواب کے انعقاد کے لئے تیار کرنا تھا۔ آخری مرحلہ استصواب کا تھا۔

ان تجاویز کو دونوں حکومتوں نے تسلیم کر لیا گو ہندوستان نے اسے اپنی توجیہات کے ساتھ منظور کیا۔ چنانچہ کمیشن التوائے جنگ کے بعد تجاویز کے باقی حصوں پر عمل درآمد کرنے کے لئے مصروفِ کار ہوا۔ لیکن ہندوستان نے کمیشن کی راہ میں طرح طرح کے روڑے اٹکانے شروع کر دیئے۔ ایک طرف ہندوستانی اخبارات نے یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ کشمیر کی تقسیم کو تسلیم کر لیا گیا ہے اور استصواب علاقہ وار یا ضلع وار ہوگا۔ دوسری طرف اربابِ حکومتِ ہند نے معاملہ کو بلطائف الحیل ٹالنا شروع کر دیا۔ نہرو نے التوائے جنگ کے کچھ بعد ہی کہنا شروع کر دیا تھا کہ استصواب کا مسئلہ بہت تاخیر طلب ہے۔ شروع شروع میں ناظم استصواب کا تقرر ہی لاینحل نظر آنے لگا تھا، لیکن بتدریج ایڈمرل نمٹز کے تقرر پر دونوں حکومتیں رضامند ہوگئیں اور ایڈمرل موصوف نے بھی اس ذمہ داری کو قبول کر لیا۔ التوائے جنگ سے متعلقہ سرحدات کے تعین پر جو بادی النظر میں سہل الحصول نظر آتا تھا کوئی سات ماہ صرف ہو گئے۔

اس دوران میں کشمیر کمیشن سے یہ عہد کرنے کے باوجود کہ وہ کوئی ایسا اقدام نہیں کریں گے جس سے کشمیری تنازع پر برا اثر پڑے نہرو نے یہ بڑ بھی ہانکی کہ دنیا کی کوئی طاقت کشمیر کو ہندوستان سے جدا نہیں کر سکتی، اس کا کفش بردار عبداللہ اس الحاق کی ہر قیمت دینے پر تیار ہو گیا اور ہندوستان کی مجلس دستور ساز نے الحاقِ کشمیر کو "جائز، مکمل اور غیر مشروط" قرار دے کر مہاراجہ کشمیر کو یہ حق دیا کہ وہ مجلس دستور ساز کے لئے چار نمائندے ریاست کی طرف سے نامزد کرے۔ کشمیر کمیشن نے ہندوستان کی ان حرکات کا دلیرانہ مقابلہ نہیں کیا بلکہ اس کی ناز برداری میں مصروف رہا۔ چنانچہ متعدد مرتبہ کمیشن نے ہندوستان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے پیغمبرے

بدلے اور تجاویز میں ردوبدل کیا۔

التوائے جنگ کی سرحدات سے متعلق تصفیہ ہوجانے پر استصواب کشمیر کے تین مدارج میں سے پہلا درجہ مکمل ہو سکا دوسرا درجہ متارکہ کا تھا۔ کمیشن نے ہندوستان اور پاکستان سے مزید علیحدہ علیحدہ مذاکرات کو مفید نہ سمجھ کر دونوں ممالک کی مشترکہ کانفرنس منعقد کرانی چاہی لیکن مجوزہ کانفرنس کے ایجنڈا تک پر اتفاق نہ ہو سکا اور بالآخر اس کے انعقاد کا ارادہ ترک کر دیا گیا۔ اگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد اور جنوری ۱۹۴۹ء کی تشریحات جنھیں ہندوستان نے بظاہر منظور کر رکھا تھا واضح اور غیر مبہم تھیں۔ ان کے مطابق دوسرے مرحلے میں پاکستان کی تمام اور ہندوستان کی بیشتر افواج کا کشمیر سے انخلا ضروری تھا۔ بقیہ ہندوستانی افواج اور آزاد کشمیر افواج سے متعلق آخری تصفیہ تیسرے مرحلہ میں ہونا تھا جبکہ دیگر امور کے خاطر خواہ فیصل ہو جانے پر استصواب کی تیاریاں شروع ہوتی تھیں۔ دوسرے مرحلہ سے متعلق مذاکرات میں ہندوستان نے مسلّم اور متعین راہ سے ہٹ کر یہ غیر متعلق مطالبہ شروع کر دیا کہ متارکہ کی جزئیات طے کرنے اور ان پر عمل پیرا ہونے سے پہلے آزاد کشمیر افواج کو غیر مسلح اور منتشر کر دیا جائے۔ ہرچند یہ تجویز آخری مرحلہ کی تھی، ہندوستان بضد رہا کہ دوسرے مرحلہ کا آغاز کرنے سے پیشتر اسے طے کیا جائے۔ یہ روش قراردادِ اگست کی صریحاً خلاف ورزی تھی، اور بعینہ اس روش سے ملتی تھی جو ان موجودہ اربابِ حکومت نے ۱۹۴۶ء میں کانگرسی نمائندوں کی حیثیت سے مشہور برطانوی پارلیمانی مشن کی تجاویز سے متعلق اختیار کی تھی۔ اس وقت بھی کانگرس نے ان تجاویز کو اپنی توجیہات کے ساتھ منظور کیا تھا جو نفس تجاویز سے اس قدر مختلف بلکہ متضاد تھیں کہ منظوری عدم منظوری کے مترادف ہو گئی تھی۔ لیکن جیسے اس وقت برطانوی نمائندوں نے اس روش کو منظوری کہہ کر اپنی کامیابی قرار دیا اسی طرح کشمیر کمیشن نے بھی ہندوستانی روش کو اپنی قرارداد کی منظوری قرار دیا اور اس کامیابی میں مگن ہو گیا۔ نتیجہ اس وقت کی طرح اب بھی لاینحل تعطل کی صورت میں مرتب ہوا۔ کمیشن نے اس تعطل کو توڑنے کی ایک انوکھی اور ناکام تجویز پیش کی۔ ہندوستان اور پاکستان کے متضاد نظریات و مطالبات میں کوئی قدرِ مشترک پیدا نہ کر سکنے پر کمیشن نے ثالثی کی تجویز پیش کی اور ثالث کے لئے ناظم استصواب ایڈمرل نمٹز کا نام پیش کیا۔ اس تجویز کو اور موثر بنانے کی یوں کوشش کی گئی کہ برطانوی وزیر اعظم اٹلی اور امریکی صدر ٹرومین نے بیک وقت ذاتی خطوط کے ذریعہ وزرائے اعظم پاکستان اور ہندوستان کو اس تجویز کے منظور کر لینے کا مشورہ دیا۔ پاکستان نے اس تجویز کو بھی منظور کر لیا اور اپنی صلح جوئی اور امن پسندی کا پورا پورا مظاہرہ کیا۔ لیکن ہندوستان نے اٹلی اور ٹرومین کے مشوروں کو ٹھکرا دیا اور ثالثی کی تجویز منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تو کمیشن کو محسوس ہوا کہ باہمی مصالحت کے امکانات روشن نہیں رہے۔ چنانچہ حفاظتی کونسل کے سامنے اپنی مشکلات پیش کر کے مزید ہدایات لینے کے لئے کمیشن برصغیر ہندوپاک سے رخصت ہو گیا۔

وداع سے پیشتر البتہ کمیشن نے ایک بیان میں ہندوستانی مطالبہ کی تغلیط کی اور بتایا کہ آزاد کشمیر افواج کو غیر مسلح اور منتشر کرنے کا معاملہ تیسرے مرحلہ یعنی استصواب کی عملی تیاری سے متعلق ہے نہ کہ دوسرے مرحلہ متارکہ سے متعلق۔ یہی پاکستان کا موقف تھا!

حال ہی میں کمیشن نے حفاظتی کونسل میں اپنی کارگذاری اور مشکلات کا جائزہ لے کر یہ سفارش کی ہے کہ ایک ثالث کے ذریعہ غیر فیصلہ شدہ امور کا تصفیہ کرایا جائے۔ حفاظتی کونسل نے ایک قرارداد کے ذریعہ اپنے صدر کو اختیار دیا ہے کہ وہ غیر رسمی طور پر پاکستان اور ہندوستان کے نمائندوں سے مل کر مسئلہ کشمیر کے حل کی ایسی صورت تلاش کریں جو دونوں کے لئے باہمی طور پر قابلِ قبول ہو۔ چنانچہ ان دنوں حفاظتی کونسل کے صدران غیر رسمی ملاقاتوں میں مصروف ہیں۔

امریکہ کی دلچسپی کشمیر کمیشن کی تازہ رپورٹ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندوستان کی غیر معقول اور خلاف قرارداد اگست و تشریحات جنوری روش کو غلط کہنے اور اپنے فیصلوں پر قائم رہنے کی بجائے ہندوستان کی ضد پر اسے مزید مراعات دینے پر تلا ہوا ہے۔ ہندوستان کی پاسداری کی وجوہ بین الاقوامی سیاست کے رجحانات کا سرسری مطالعہ کرنے سے نمایاں ہو جاتی ہیں۔ روس اور امریکہ کی عالمگیر استیلائی مسابقت نے کہ سیاست عالم کا نقطہ ماسکہ بن چکی ہے، کشمیر پر اپنا سایہ ڈالنا شروع کر دیا ہے۔ ایشیا میں ہمہ گیر خلفشار پایا جاتا ہے اور استعماریت کے پروردہ نظام ہائے حکومت کے خلاف عام جذبات بغاوت پائے جاتے ہیں۔ یہ جذبات بغاوت عملی انقلابات کی صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ چین برسوں کی خانہ جنگی کے بعد ایک فیصلہ کن دور میں داخل ہو چکا ہے۔ امریکہ کا منظورِ نظر چیانگ کائی شیک امریکی ڈالر کے بوجھ کے نیچے دم توڑ رہا ہے اور کمیونسٹ "باغی" قریباً سارے چین پر قابض ہو چکے ہیں۔ ہر چند دیگر ایشیائی ممالک میں اندرونی انقلابات فیصلہ کن مراحل تک نہیں پہنچے لیکن مستقبل سے متعلق پیشین گوئی چنداں مشکل نہیں۔ صرف ایک چین کے "سرخ" ہو جانے سے ایشیا کا توازن قوی غیر معمولی حد تک روس کے حق میں اور امریکہ کے خلاف ہو گیا ہے۔ چین سے پسپا ہو کر امریکہ ہندوستان میں قدم جمانے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ قدرتی طور پر چین کے بعد ہندوستان ہی محلِ وقوع کے اعتبار سے امریکہ کی ضرورت پوری کر سکتا ہے۔ اب تک کا مشاہدہ یہی ہے کہ امریکہ نے جس زمین میں بھی ڈالر کے سنہری بیج بوئے ہیں اس سے کمیونزم کی 'سرخ' فصل ہی کاٹی ہے۔ اس کے باوجود وہ اس کاشت و کار میں دیوانہ وار مصروف ہے۔ تمام کرۂ ارض اس کیلئے ایک کھیت بن چکا ہے۔ اب اس کی نظریں ہندوستان پر ہیں۔ ہندوستانی ارباب حکومت کے فسطائیانہ عزائم نے ملک کو جن سیاسی اور اقتصادی مشکلات میں مبتلا کر دیا ہے اس سے اس زمین کی 'زرخیزی' امریکہ کی نگاہوں میں اور بڑھ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دنوں اس کی التفاتِ فراواں کا مرجع ہندوستان ہے۔ نہرو بھی چیانگ کائی شیک کی طرح امریکہ کو ہی حلّ المشکلات سمجھنے لگ گیا ہے چنانچہ اس نے حال ہی میں صدر ٹرومین کی دعوت پر امریکہ کا دورہ کیا ہے۔ اس کے عازم امریکہ ہونے سے پیشتر حکومتِ ہندوستان نے کمیونسٹوں کے خلاف قرار جرم شائع کی اور بعض صوبوں میں ان کی جماعتوں کو ممنوع قرار دیدیا۔ یوں براہِ راست امریکہ کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کے ساتھ اس نے اپنی امن پسندی کا بھی ڈھنڈورہ پیٹا۔ ایک طرف تو اس نے مشرق و مغرب کی کشمکش سے الگ تھلگ رہنے کا اعلان کیا اور دوسری طرف پاکستان کو یہ 'دعوت' دی کہ وہ ہندوستان سے معاہدہ کرے کہ جملہ امور متنازع کا حل

باہمی مذاکرات سے کرے گا نہ کہ جنگ سے۔ دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکتے وقت ہندوستان کا یہ عطائی امن پسند جونا گڈھ، حیدرآباد کشمیر، متروکہ جائداد کا آرڈیننس، نہری پانی کی تقسیم، پاکستان کے خلاف اقتصادی جنگ وغیرہ حادثات کو یک قلم فراموش کر گیا۔ یہ تمام مسائل جن کا ایک ایک مسئلہ بجائے خود انصاف و جمہوریت کا مقتل ہے ہندوستان ہی کے پیدا کردہ ہیں۔ ان داعیات سے یہ اثر پیدا کرنا مقصود تھا کہ ہندوستان کے عزائم امن پسندانہ اور صلح بردار ہیں۔ ان بلند بانگ دعاوی کے پردوں کے پیچھے نہرو نے سیاسی سودے کئے۔ امریکہ نے ہندوستان پر حفاظتی کونسل کی رکنیت کی نوازش بیجا کی اور ان احتجاجات کو مطلقاً شائستہ اعتنا نہ سمجھا کہ جب تک مذکورہ کونسل میں کشمیر کا مقدمہ پیش ہے، ہندوستان کو کہ اس مقدمہ کا ایک فریق ہے، کونسل کی نشست پر متمکن کر کے اپنے ہی مقدمے کا جج نہ مقرر کیا جائے۔ سال نو سے اس نئی حفاظتی کونسل کا دور شروع ہو جائے گا جس کا رکن ہندوستان کو بنایا گیا ہے۔ کشمیر سے متعلق جملہ اقدامات اسی پس منظر میں ہوں گے۔

برطانیہ کا مفاد

برطانیہ بھی ہندوستان کی اس "اہمیت" کا غیر معمولی احساس رکھتا ہے۔ تقسیم سے پیشتر سیاسیین لندن کا نمایاں رجحان ارباب کانگرس کی طرف تھا۔ تقسیم کے بعد بھی یہ رجحان نمایاں رہا اور اسی طرح نمایاں چلا آرہا ہے۔ چنانچہ زیر نظر سال کی وزرائے اعظم دولت مشترکہ کی کانفرنس بدیں وجہ منعقد کی گئی کہ ہندوستان کو جو نئے دستور کے مطابق "ری پبلک" کی حیثیت اختیار کرنا چاہتا ہے، بدستور دولت مشترکہ میں رکھا جائے۔ مذکورہ کانفرنس نے بالآخر اس کی قابل عمل صورت ڈھونڈھ ہی نکالی اور ری پبلک ہو جانے کے باوجود یہ گنجائش پیدا کر دی کہ ہندوستان دولت مشترکہ کا رکن رہ سکے۔

چین کی تبدیلی ہیئت نے برطانیہ کے لئے بھی کچھ کم الجھن پیدا نہیں کی۔ روسی چین کا تصور ہی اس کے خلل دماغ کے لئے کافی ہے۔ کمیونزم کی فاتحانہ یلغار کا اثر لامحالہ اس کے جنوب مشرقی ایشیائی مفادات پر پڑے گا۔ اس حصہ ارض کے دیگر ممالک کی طرح ملایا میں بھی اندرونی بدامنی پھیلی ہوئی ہے۔ برطانیہ کی فوجیں ڈیڑھ برس سے وہاں کے دہشت پسندوں اور کمیونسٹوں سے خلاف ناکام جنگ لڑ رہی ہیں۔ جس سیلاب بلا کو روکنے سے امریکہ بھی عاجز آگیا ہو اس کے مقابلہ کی سکت برطانیہ میں کہاں۔ برطانیہ کے سرمایہ لہٰذا تجارتی مفاد کا تحفظ بھی نہایت ضروری ہے، جو اس امر کا متقاضی ہے کہ چین کی نئی حکومت کی خوشامد کی جائے تاکہ تجارتی اداروں پر زد نہ پڑے۔ چنانچہ یہ اور دیگر متعلقہ امور پر غور و خوض کرنے کے لئے دولت مشترکہ کے وزرائے خارجہ کی ایک کانفرنس شروع جنوری میں کولمبو میں منعقد ہو رہی ہے۔ کولمبو کا انتخاب ہی اس پر شاہد ہے کہ ایشیائی امور نمایاں طور پر زیر بحث آئیں گے۔

مجوزہ کانفرنس اور دولت مشترکہ کی وہ کانفرنسیں جو قیام پاکستان کے بعد منعقد ہوئیں ان سے مترشح ہوتا ہے کہ جب برطانیہ کے ملکی مفاد پر زد پڑتی ہے تو وہ فوراً دولت مشترکہ سے استصواب و استمداد کرتا ہے مگر جب اجزائے دولت کا مفاد خطرے میں ہوتا ہے تو وہ مزعومہ غیر جانبداری اور عدم مداخلت سے کام لیتا ہے۔ پاکستان کے معاملات میں تو اس نے خلاف پاکستان جانبداری سے ہی

کام لیا ہے۔ ہندوستان نے پاکستان کو ناکام بنانے کے لئے جو گوناگوں موانعات و مشکلات پیدا کیں، بلکہ جونا گڈھ اور کشمیر کے معاملہ میں تو اس نے پاکستان کے خلاف جنگ کی طرح بھی ڈال دی، لیکن برطانیہ اور دولت مشترکہ تماشائی کی حیثیت سے دیکھا کئے۔ صحیح تر الفاظ میں برطانیہ کو تماشائی نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ اس میں غیر جانبداری پائی جاتی ہے، حالانکہ برطانیہ کی روش پاکستان سے متعلق غیر ہمدردانہ رہی اور ہندوستان کے حق میں وزرائے اعظم دولت مشترکہ کی جو کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی، اس کے دوران میں لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان کو یہ تلخ تجربہ ہوا کہ برطانیہ پاکستان کو مٹی کا مادھو سمجھتا ہے اور صرف ہندوستان کی دلداری کرتا ہے۔ چنانچہ کانفرنس سے فارغ ہو کر کراچی میں آپ نے فرمایا:

> دولت مشترکہ میں طویل اور اہم ترین دفاعی سرحدات صرف پاکستان کی ہیں۔ اس کے باوجود برطانیہ نے پاکستان کو مطلوبہ مادی اور عملی امداد سراسر تک دی ہے، نہ اب ہی دے رہا ہے، جس سے پاکستان اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکے۔

پاکستان کے خلاف جنگ

ہندوستان کی سیاست مخالفتِ پاکستان کے محور کے گرد گھومتی ہے۔ اس کی سیاست کا تمام تر مدار اندرون و بیرون ملک یہی ہے کہ پاکستان کو کیسے ناکام بنایا جائے۔ اس ضمن میں اس نے جو براہ راست اقدامات کئے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ مشرقی پنجاب، اس کی ریاستوں، دہلی اور مضافات کے مسلمانوں کو بے دریغی سے تہ تیغ کیا گیا اور بقیۃ السیف کو انتہائی درماندگی کی حالت میں پاکستان کی طرف دھکیل دیا گیا۔ پاکستان روز اول سے ہی اس ہلاکت آفریں گرداب میں پھنس گیا، مگر حسنِ قسمت سے وہ اس ہلاکت سے بچ نکلا۔ پاکستان اس سیلابِ بلا کے مہیب تھپیڑوں سے سنبھل نہیں سکا تھا کہ کشمیر کی طرف سے بے خانماں اور تباہ حال مظلومین کا ریلا آ گیا۔ آہستہ آہستہ ہندوستان کے دیگر شہر یکے بعد دیگرے مسلمانوں سے خالی ہونے شروع ہو گئے۔ مسلمانانِ ہندوستان کو بدر کرنے کی غیر سرکاری تحریک زیرِ نظر سال میں حکومتِ ہند نے اپنے ہاتھ میں لے لی، اور ہر چند بین المستعمراتی معاہدہ کی رو سے وہ ایسا کرنے کی مجاز نہیں تھی تاہم اس نے متروکہ جائدادوں سے متعلق ایک آرڈیننس جاری کر دیا جو تمام ہندوستان پر نافذ ہو گیا۔ اس کا بے محابا استعمال ہوا اور ہو رہا ہے۔ اپنے مسلمانوں کی جائدادوں کو بھی متروکہ قرار دے کر ہندوؤں کے تصرف میں دیدیا گیا ہے جو ہندوستان تو کیا اپنا شہر چھوڑ کر بھی نہیں گئے تھے۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ مسلمانوں کو گھروں سے زبردستی نکال دیا گیا اور ان کی جائدادوں کو متروکہ قرار دیدیا گیا۔ دیکھتے دیکھتے اس قسم کے تارکین وطن جالندھر کے کیمپ میں جمع ہونے شروع ہو گئے۔ ان دنوں ان مظلومین کی خوراک کی ذمہ داری پاکستان نے لے رکھی ہے، کیونکہ ہندوستان کی حکومت نے ان کے لئے خوراک مہیا کرنے سے انکار کر رکھا ہے۔ اس تحریک انخلا کا رُخ اب آسام کی طرف بھی ہو گیا ہے۔ وہاں کی کانگرسی حکومت برطانوی عہد میں بھی مسلمان آبادکاروں کو زمینوں سے بے دخل کر کے صوبے سے نکال رہی تھی تقسیم سے یہ رفتار مدہم ہو گئی تھی۔ اس تحریک استبداد میں پھر سے جان آ رہی ہے اور حکومتِ آسام مسلمان کاشتکاروں کو جنہوں نے خون پسینہ ایک کر کے آسام کے جنگلات کو

لہلہاتے کھیتوں میں تبدیل کر رکھا ہے، اور جو غاصب نہیں بلکہ نسلاً بعد نسلٍ انہی زمینوں کی کاشتکاری کرتے چلے آرہے ہیں۔ آج ان زمینوں سے بے دخل کر رہی ہے اور انھیں ذرائع معاش سے محروم کر کے پاکستان چلے جانے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔

پنجاب کی نہروں کا مسئلہ جس نے سنہ ۱۹۴۸ء میں خطرناک صورت اختیار کر لی تھی اب کے پھر تشویش کا باعث رہا اور ہندوستان کی فتنہ پسندی نے اسے حل نہیں ہونے دیا۔ اس سال کی بین المستعراتی کانفرنس بے نتیجہ ختم ہو گئی۔ اس غیر مصالحانہ روش کے جواز میں ہندوستان نے یہ لاطائل دلیل دی کہ مشرقی پنجاب کے مفاد کو شدید نقصان پہنچائے بغیر پاکستان کو پانی مہیا نہیں کیا جا سکتا۔ مصالحت جوئی کی جملہ مساعی کو اکارت جاتے دیکھکر پاکستان نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ اس معاملہ کو اقوام متحدہ یا بین الاقوامی عدالت میں پیش کیا جائے لیکن ہندوستان نے اس منصفانہ تجویز کو ٹھکرا دیا۔ پھر پاکستان نے یہ تجویز پیش کی کہ مشرقی بنگال اور ہندوستان کی سرحدات سے متعلق تنازع کے تصفیہ کے لئے جو ٹریبونل سویڈن کے جج کی صدارت میں مصروف کار ہے یہ معاملہ بھی اسی کے سپرد کر دیا جائے۔ ہندوستان نے اسے بھی ٹھکرا دیا۔ پاکستان مصر ہے کہ اس معاملہ کو ٹریبونل کے سپرد کیا جائے۔ ہندوستان بدستور انکار کئے جا رہا ہے۔

معاشی محاذ تجارت میں پاکستان کی پوزیشن کافی مستحکم ہے۔ اس کی خام اجناس، مثلاً جوٹ، روئی، چمڑہ وغیرہ ایسی ہیں جن کی تمام دنیا میں مانگ ہے۔ جوٹ اور روئی کا سب سے بڑا گاہک ہندوستان تھا اور اس کے کارخانے پاکستانی خام پیداوار پر ہی چل رہے ہیں۔ اس کی مصنوعات خصوصیت سے جوٹ کی ساختہ اشیاء اور کپڑے کی بڑی منڈی پاکستان ہے۔ پاکستان ہندوستانی کوئلے اور چینی کا بھی گاہک تھا، لیکن آہستہ آہستہ بے خردی اور بے تدبیری سے ہندوستان نہ محض پاکستانی خام اجناس کو ہاتھ سے کھو رہا ہے بلکہ وہ اپنی مصنوعات کی پاکستانی منڈی کو بھی ضائع کر رہا ہے۔ اور یہ سب کچھ محض اس ضد میں کہ وہ پاکستان کی تجارت کو متوازن اور مستحکم نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن اس ضمن میں اس کے جملہ اقدامات اسی کی تجارت اور اقتصادی حالت کو مخدوش بنا رہے ہیں۔ پاکستان کافی عرصے ہندوستانی چینی سے بے نیاز ہو چکا ہے۔ وہ دوسرے ممالک سے کافی مقدار میں سستے داموں چینی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ یہ نئے ذرائع رسد ہندوستان کے برعکس معتمد اور یقینی ہیں۔ پاکستان میں کوئلہ کی کمی ہے اور وہ اپنی ضرورت کا دو تہائی ہندوستان سے لیتا ہے۔ ہندوستان اس کمی کو بزعم خود بطور حربہ استعمال کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ ایک سے زیادہ مرتبہ اس نے معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پاکستان کو مطلوبہ کوئلہ دینے سے انکار کر دیا۔ اس انکار کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ پاکستان نے ریلوے انجنوں اور دیگر کارخانجات میں کوئلہ کے بجائے تیل استعمال کرنے کی طرح ڈال دی ہے۔ توقع ہے کہ آہستہ آہستہ کوئلے کے مصرف کم سے کم رہ جائیں گے۔ دوسرے پاکستان نے متبادل ذرائع رسد کا جائزہ لینا شروع کر دیا ہے۔ کئی ایسے ممالک ہیں جو پاکستان کو کوئلہ مہیا کر سکتے ہیں۔ پاکستان کے اپنے کوئلہ کے ذرائع بھی چنداں حقیر نہیں، البتہ ان کی طرف ابھی کما حقہ توجہ نہیں دیجا سکی۔

بایں ہمہ بلوچستان اور مغربی پنجاب کے ذخائر کی جانچ پڑتال ہو رہی ہے۔ کپڑے کے معاملہ میں بھی پاکستان اپنے ہاں کارخانے قائم کرنے کے علاوہ دیگر ممالک سے روابط قائم کر رہا ہے جو شریفانہ طریق سے تجارتی تعلقات کو نباہ سکیں۔

پاکستانی روپیہ ہندوستان کی غذائی حالت مخدوش ہے۔ اندازہ ہے کہ وہاں تیس لاکھ ٹن گندم کی کمی ہے۔ اس کی موجودہ رفتار آبادی کے مطابق ہر سال مزید پانچ لاکھ ٹن کی کمی واقع ہو رہی ہے۔ پاکستان غذا کے معاملہ میں خوش قسمت ہے اس کے پاس امسال پانچ لاکھ ٹن گندم برآمد کے لئے فالتو موجود ہے۔ بین المستعمراتی تجارتی معاہدہ کی رو سے پاکستان کو ۱۷۵۰۰۰ ٹن گندم ہندوستان کو مہیا کرنی تھی۔ ہندوستان کی حالت یہ ہے کہ خود نہرو نے ہندوستانیوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ کیلے زیادہ کھا کر اناج کی بچت کریں۔ نیز وہاں "ہفتہ میں ایک وقت کا کھانا کھاؤ" کی تحریک بھی شروع ہو رہی ہے۔ اس احتیاج کے باوجود ہندوستان نے معاہدہ میں طے شدہ گندم کی مقدار جو پاکستان میں ہندوستان کو بھیجنے کے لئے تیار رکھی تھی، لینے سے انکار کر دیا۔ ادھر پاکستانی گندم اٹھانے سے انکار کر دیا گیا اور اُدھر نہرو نے امریکی سفر میں امریکی گندم کی درآمد کا سودا کر لیا۔ وہ امریکہ سے صرف ایک لاکھ ٹن مقدار حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکا ہے جو بہت ناکافی مقدار ہے۔ اس طرح ہندوستان کی حکمت عملی ہندوستان اور پاکستان کو مختلف معاشی راہوں پر ڈال رہی ہے، وہ وقت دور نہیں کہ مشترکہ معاشی مفادات واقتضاآت کے یہ دو ملک اقتصادی طور پر معاون و رفیق ہونے کے بجائے بالکل برعکس سمتوں میں چل دیں۔ اس کی ساری ذمہ داری ہندوستان کے سر ہو گی لیکن پاکستان کے بخت کی یاوری ان کے اس شر سے بھی خیر کے پہلو نکالے گی اور ان کوتاہ آستینوں کی دراز دستیوں کے تصدق یہ نخل بلند رفیع سے رفیع تر ہوتا جائے گا۔

معاشی محاذ کا اہم ترین معرکہ تخفیف یا عدم تخفیف زر کا مسئلہ ثابت ہوا۔ جنگ سے پیدا شدہ حالات نے برطانیہ کی تجارت درآمد و برآمد میں جو عدم توازن پیدا کر دیا تھا اس سے مجبور ہو کر ستمبر میں برطانیہ نے سٹرلنگ کی قیمت میں ۳۱ فی صدی کی کمی کر دی۔ اس کے لگ بھگ دیگر بہت سے ممالک نے جن میں ہندوستان بھی شامل تھا ڈالر کے مقابلہ میں اپنے سکوں کی شرح تبادلہ میں تخفیف کر دی۔ پاکستان کے لئے یہ بڑے غور و فکر کا مقام تھا۔ اس کی تجارتی حالت قابلِ رشک تھی، کیونکہ اس کی درآمد و برآمد کا توازن ناموافق نہ تھا۔ تخفیف جس مرض کا مداوا سمجھی گئی ہے پاکستان کا معاشی نظم اس سے محفوظ تھا۔ لہٰذا تخفیف خارج از بحث تھی۔ مزید برآں پاکستان کی ضرورت مشینیں تھیں جو ڈالر حلقہ سے دستیاب ہو سکتی تھیں۔ ڈالر کے مقابلہ میں روپیہ کی قیمت کم کرنے کا مطلب یہ ہوتا کہ پاکستان کو مشینیں گراں قیمت پر ملتیں جس سے اس کی صنعتی ترقی پر برا اثر پڑتا۔ روپیہ کی قیمت گر جانے سے اندرونِ ملک یقینی طور پر قیمتیں بڑھ جاتیں جس سے عوام کی قوتِ خرید کم ہو جاتی اور ان کا معیارِ زیست فروتر ہو جاتا۔ المختصر تخفیف سے پاکستان گوناگوں معاشی پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتا۔ پاکستان نے کامل غور و خوض اور معاشی تدبر کے بعد بالآخر روپیہ کی قیمت برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا، چونکہ سٹرلنگ اور ہندوستانی روپیہ کی قیمتوں میں تخفیف ہو چکی تھی اس لئے پاکستانی روپیہ کی قیمت خود بخود ان دونوں سکوں کے مقابلہ میں بڑھ گئی۔ فیصلہ عدم تخفیف دال تھا ملک

کی مستحکم معاشی پوزیشن پر۔ ہندوستان کے نزدیک پاکستان کی کامیابی اس کی شکست ہے۔ اس نے پاکستان کی شرحِ تبادلہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور یہ الزام لگایا کہ پاکستان نے .... معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس خلاف ورزی کی وجہ یہ بتائی گئی کہ مذکورہ معاہدہ کی رو سے کوئی ملک بلا مشورہ فریقِ ثانی شرحِ تبادلہ میں تبدیلی نہیں کر سکتا۔ اس معاہدہ کی خلاف ورزی تو دراصل ہندوستان نے کی کیونکہ شرحِ تبادلہ کی تبدیلی پاکستان نے نہیں بلکہ ہندوستان نے کی۔ اور ہندوستان نے یہ فیصلہ تخفیف پاکستان سے مشورے کے بغیر کیا۔ پاکستانی روپیہ کی قیمت نہ گھٹی نہ بڑھی۔ قیمت تو ہندوستانی روپیہ کی گھٹی۔ بہرکیف ہر چند پاکستان کے فیصلہ عدم تخفیف کا اثر دیگر ممالک پر بھی پڑا اس کے خلاف عملی احتجاج صرف ہندوستان نے ضروری سمجھا اور یہ اس کی حماقت ہے کیونکہ پاکستان مجبور نہیں کہ وہ اپنے فیصلے ہندوستانی فیصلوں کے تابع رکھے۔ وہ اپنے حالات کا مالک ہے اور ان کے مطابق فیصلہ کرنے کا مجاز۔ چنانچہ اگرچہ پاکستان اور ہندوستان کے مابین تجارت بند پڑی ہے گو ہندوستان میں پاکستانی روپیہ بلیک مارکیٹ میں زیادہ قیمت پر بک رہا ہے۔

پاکستان کے فیصلہ عدم تخفیف کو تسلیم نہ کرنے کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے ذمے پاکستان کی گراں قدر رقوم واجب الادا ہیں، ان رقوم کی مجموعی مقدار ہندوستانی روپیہ کی قیمت میں تخفیف ہونے سے خود بخود بڑھ جاتی ہے۔ ہندوستان اس ادائیگی میں اس بہانہ سے تاخیر کرنا چاہتا ہے۔ ہندوستان کی اس حرکت کی یاد ابھی تک تازہ ہے کہ ۱۹۴۷ء میں اس نے پاکستان کا پچپن کروڑ روپیہ ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا اور بسیار خرابی کے بعد ادا کیا تھا۔ ایسے ہندوستان سے کچھ بھی مستبعد نہیں۔

جوٹ پاکستان کے فیصلہ عدم تخفیف کا نمایاں اثر جوٹ پر پڑا۔ پاکستانی روپیہ کی قیمت ڈالر کے مقابلہ میں تو وہی رہی لیکن سٹرلنگ کے مقابلہ میں بڑھ گئی، جس کا مطلب یہ ہے کہ جوٹ کی قیمت سٹرلنگ میں زیادہ ہوگئی یعنی جوٹ سٹرلنگ حلقہ میں گراں ہوگئی۔ اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ ضروری ہوگیا کہ گاہکوں کو مناسب داموں پر جوٹ مہیا کی جائے تاکہ جملہ پیداوار کی کھپت ہو سکے۔ ہندوستان کے مارواڑیوں نے جن کا کاروباری جال وسیع طور پر مشرقی بنگال میں پھیلا ہوا ہے اور جو تقسیم سے پیشتر سے جوٹ کے ذرائع رسد پر قابض ہیں، اس صورت کو غلط رنگ میں پیش کر کے غریب کاشتکاروں کی غربت اور جہالت سے فائدہ اٹھا کر سستے داموں جوٹ خریدنا شروع کر دی۔ پاکستانی حکومت نے بروقت متنبہ ہو کر جوٹ کی کم سے کم قیمت مقرر کر دی اور اس سے کم قیمت پر جوٹ کی فروخت آرڈیننس کی رو سے ممنوع قرار دے دی۔ نیز یہ بھی اعلان کر دیا کہ اگر اس قیمت پر خریدار نہ ملیں تو ساری کی ساری جوٹ حکومت خرید لے گی۔ مگر اس دوران میں بد دیانت اور چالاک ہندوستانی تاجر کافی جوٹ ناجائز طریقوں سے ہندوستان لے گئے لیکن پاکستانی حکومت کا خیال ہے کہ یہ ناجائز تجارت منقطع ہوگئی۔ یہ دیکھ کر ہندوستان نے پاکستانی جوٹ کا مقررہ حصہ خریدنے سے انکار کر دیا۔ اس انکار سے وہ یہ غلط فہمی پیدا کرنا چاہتا تھا کہ ہندوستان جو پاکستانی جوٹ کا سب سے بڑا گاہک ہے جوٹ خریدنے سے انکار کر دے گا تو پاکستان کو کوئی گاہک نہیں ملے گا۔ لیکن جوٹ کی مانگ کا یہ حال ہے کہ ادھر ہندوستان نے انکار کیا ادھر پاکستان کو کئی نئے

گاہک مل گئے۔ ہندوستان کے اس انکار کا اثر اسی کے جوٹ کے کارخانوں پر پڑے گا۔ پاکستان کو اس سے یہ فائدہ ہوا کہ وہ اپنے کارخانے قائم کر رہا ہے۔ دراصل یہ حرکات ہندوستان کی اعصابی جنگ کے حیلے تھے۔ وہ مکر و زور سے پاکستان کو مجبور کر دینا چاہتا تھا کہ وہ اپنے روپیہ کی قیمت گرا دے۔ غیر ملکی تجارت میں پاکستانی جوٹ سب سے زیادہ ڈالر حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ ہندوستان اس ذریعہ کو درہم برہم کرکے پاکستان کے توازنِ تجارت کو متزلزل کر دینا چاہتا ہے۔ وہ دو دھارے حربے استعمال کر رہا ہے۔ ایک طرف مکاری سے پاکستانی جوٹ نہایت سستے داموں خرید رہا ہے اور دوسری طرف اس سازش میں مصروف ہے کہ پاکستانی روپیہ کی قیمت گر جائے۔ چنانچہ جب پاکستان نے عدم تخفیف کا فیصلہ کیا تو ہندوستانی وزراء نے علی الاعلان نہایت غیر ذمہ داری سے کہنا شروع کر دیا تھا کہ عنقریب پاکستان کو روپیہ کی قیمت گرا دینی پڑے گی۔ ان وزراء کو اپنے مکر و فن پر مکمل بھروسہ تھا!

حکومت پاکستان نے جوٹ کی تجارت کو برقرار رکھنے کے لئے ایک جوٹ بورڈ کی تشکیل کی اور نیشنل بنک آف پاکستان کا اجرا کر دیا تاکہ وہ مصدقہ ایجنٹوں کو علاوہ سرمایہ بہم پہنچائے جس سے وہ آسانی سے جوٹ خرید سکیں۔ یہ بنک روئی کی تجارت پر عنقریب توجہ دیگا اگلے مالی سال سے باقاعدہ بنک کا کاروبار سر انجام دینا شروع کر دیگا اور فطرت کی کرم گستریاں اس کاروبار میں برکت دیں گی۔

آئینِ پاکستان

پاکستان کے آئین کی اساس کیا ہوگی؟ یہ تھا وہ سوال جو حصولِ پاکستان کے بعد دوست دشمن کی زبان پر تھا۔ دوستوں کی زبان پر اس لئے کہ جن حسین تمناؤں اور تابندہ آرزوؤں کو سامنے رکھ کر مسلمانانِ ہندوستان نے تحریک پاکستان میں حصہ لیا تھا، ان کی عملی تشکیل کو مشہود و محسوس پیکر میں بے نقاب دیکھنا ان کے لئے عید نظارہ تھا اور اس میں کسی قسم کی تاخیر باعث ہزار اضطراب۔ دوسری طرف دشمنوں کی زبان پر اس لئے کہ وہ اس ابہام سے لوگوں میں طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا کرتے تھے تاکہ انہیں مشئوم و مذموم عزائم کے بروئے کار لانے میں تائید حاصل ہو جائے۔ خدا خدا کرکے اربابِ حکومت کی مہر سکوت ٹوٹی اور اوائل مارچ میں وزیراعظم نے مجلس آئین ساز میں قرارداد مقاصد پیش کی۔ یہ قرارداد جزئی اسقام کے باوجود ایک اہم اصول کی آئینہ بردار تھی۔ اس قرارداد سے جمہور کے دلوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی لیکن اس کے بعد اس کی وجہ سے جو مشکلات پیدا ہو رہی ہیں وہ بھی اربابِ بصیرت سے پوشیدہ نہیں۔

پاکستان میں مولوی صاحبان کی پہلے ہی کچھ کمی نہ تھی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف خلفشار نے اس طبقہ کو حواس باختہ کر دیا اور ان کا معتدبہ حصہ پاکستان کی طرف منتقل ہو کر آ گیا۔ ان لوگوں کا ذریعۂ معاش مذہب ہی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ انہیں کوئی کام نہیں آتا۔ نتیجہ یہ کہ اب اس بیکار طبقہ کی ایک کثیر تعداد پاکستان میں جمع ہو چکی ہے اور مختلف قسم کی مصیبتوں کا باعث بن رہی ہے۔ انہیں ضرورت ہے کہ عوام میں اپنی مقبولیت اور اہمیت قائم کریں۔ چنانچہ اس کیلئے طرح طرح کے کھیل کھیلے جا رہے ہیں۔ قرارداد مقاصد پاس ہوئی تو ان میں سے ایک گروہ نے بلند آہنگ نعرے لگانے شروع کر دیئے کہ

دیکھئے! بالآخر حکومت کو ہمارے مطالبہ کے سامنے جھکنا پڑا۔ ہم نے اپنا مطالبہ تسلیم کرا کر چھوڑا۔ (یہ "مطالبہ" وہ تھا جو انھوں نے پوسٹ کارڈوں اور لفافوں کی پشت پر چھپوا رکھا تھا)۔

قرار دادِ مقاصد کے پاس ہو جانے کے بعد اب مولوی صاحبان کے مختلف گروہوں کی طرف سے آوازیں بلند ہو رہی ہیں کہ شریعتِ حقہ کے مطابق آئین مرتب کرنا ہمارا کام ہے۔ اس فریضہ کو ہمارے سپرد کرو۔ اربابِ حکومت میں ایسے افراد موجود ہیں جو اس حقیقت کا احساس رکھتے ہیں کہ اگر آئین کی ترتیب ملا کے ہاتھ میں دیدی گئی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ چنانچہ اس بنا پر حکومت عجیب کشمکش کے عالم میں ہے۔ مُلا نے عوام پر اپنا تسلط جما رکھا ہے۔ عوام کو ناراض کرنا حکومت کے لئے مشکل ہے۔ دوسری طرف آئین سازی کا کام مُلا کے ہاتھ میں دیدینا بھی بیحد خطرناک ہے، انہیں ان دو طرفہ مشکلوں سے نکلنے کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن یہ مشکل کوئی ایسی مشکل نہیں جس کا حل نہ مل سکے۔ حل موجود ہے لیکن اس کے لئے ذرا جرأت درکار ہے۔ اسلامی حکومت کے نظام و آئین کی ترتیب کے لئے کسی مُلا کی ضرورت ہی نہیں۔ اس کا سرچشمہ فقط قرآن ہے۔ اور قرآن کوئی مشکل کتاب نہیں۔ قرآن میں آئین کے اصول دیدیئے گئے ہیں جن کی روشنی میں ہر زمانہ کے مسلمان اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق، جزئیات خود متعین کر سکتے ہیں۔ ان جزئیات کی تعیین کے لئے قرآن کے اصول اور عہدِ حاضر کے تقاضوں سے واقفیت درکار ہے۔ مُلا کے پاس ان دونوں میں سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ کام اس کے بس کا ہے نہیں۔ قوم کے اربابِ بصیرت جو عصرِ حاضر کے تقاضوں کا علم رکھتے ہیں اگر قوان کے اصولوں سے باخبر ہو جائیں تو صحیح اسلامی آئین نہایت آسانی سے مرتب ہو سکتا ہے۔ اس کیلئے ایک تو اس موقعہ پر جرأت کی ضرورت ہے کہ یہ اعلان کر دیا جائے کہ ہمارے آئین کی بنیاد قرآن کے اصول ہوں گے۔ اور اس کے ساتھ ہی مُلا کی معاش کی کوئی صورت پیدا کر دی جائے۔ مُلا کا سارا مسئلہ معاشی ہے۔ بات بالکل واضح ہے۔ اسے دنیا میں کوئی کام نہیں آتا جس سے وہ اپنی روٹی کما سکے۔ روٹی کے تقاضے انسان کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتے۔ جب تک ملا کی روٹی کا انتظام نہیں ہو جاتا یہ قوم کو کبھی آرام سے نہیں بیٹھنے دیگا۔ لہٰذا اس مصیبت کا حل یہی ہے کہ بیکاروں کے اس طبقہ کی روٹی کا انتظام کر دیا جائے اور آئندہ کے لئے وہ تمام راہیں بند کر دی جائیں جن سے یہ بیکار طبقہ وجود میں آکر مستقل فتنہ کا سامان بنا رہتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اربابِ اقتدار مُلا کو خاصی اہمیت دے چکے ہیں حتیٰ کہ یہ طبقہ سمجھنے لگ گیا ہے کہ قصرِ حکومت کے دو ستونوں میں ایک ستون ہم ہیں۔ یہ حقیقت ایک واقعہ سے بآسانی سمجھ میں آجائے گی۔ علامہ شبیر احمد عثمانی (علیہ الرحمہ) کو لوگوں نے تعظیماً اور تبرکاً "شیخ الاسلام" کہنا شروع کر دیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد اب مولوی صاحبان کے مختلف گروہوں میں "شیخ الاسلامی" کے لئے رسہ کشی ہو رہی ہے۔ یعنی انھوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ گورنر جنرل کی طرح "شیخ الاسلام" بھی ایک منصب کا نام ہے۔

یہ گروہ "شیخ الاسلامی" کے راستے مسندِ حکومت کی طرف لپکنے کی فکر میں ہے اور "اسلامی مطالبہ" والا گروہ

الیکشن کے راستے قصرِ اقتدار تک پہنچنے کی کوشش میں۔

فطرت کی طرف سے پاکستان کو ایک سادہ جبیں عطا ہوئی تھی جن پر ہم اپنی تقدیر خود اپنے ہاتھ سے لکھ سکتے تھے۔ یہاں نہ ملوکیت کا استبداد پہلے سے مسلط تھا نہ پیشوائیت (Theocracy) کی لعنت مستولی۔ ہم یہاں منشائے خداوندی کے مطابق اسلامی نظام قائم کر سکتے تھے۔ اس کے لئے فضا بھی سازگار تھی اور عصرِ حاضر کے تقاضے بھی ساعد۔ لیکن ہمیں ڈر ہے کہ اگر اربابِ اقتدار نے عوام پسندی کے خیال سے مرعوب ہو کر، ملا کی اہمیت کو اسی طرح بڑھنے دیا تو یہ خطۂ زمین انسانیت ساز جنت بننے کے بجائے، انسانیت سوز جہنم بن کر رہ جائے گا۔ لہٰذا اربابِ فکر و نظر کے لئے، تاریخ کا یہ دور اپنے اندر بڑی نزاکت اور اہمیت رکھتا ہے۔

آئین کے ضمن میں ان ریاستوں کا مسئلہ بھی سامنے آتا ہے جنہوں نے پاکستان سے الحاق کر لیا ہے۔ یہ ریاستیں جمہوری اداروں سے محروم ہیں اور کم و بیش شخصی جاگیریں ہیں۔ دو ایک ریاستوں نے حال ہی میں "اصلاحات" کی ابتدائی قسطیں رعایا کو عطا کی ہیں۔ صوبہ سرحد کی ریاستوں سے متعلق ایک عرصے سے تشویشناک اطلاعیں آ رہی تھیں۔ ستمبر کے آخر میں پاکستان مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری، یوسف خٹک، نے بھی تسلیم کیا کہ ان ریاستوں میں سیاسی کارکنوں پر عرصۂ عافیت تنگ کیا جا رہا ہے اور سیاسی قیدیوں اور ان کے لواحقین سے غیر انسانی سلوک روا رکھا جا رہا ہے۔ لیکن حال میں وزیرِ اعظم پاکستان نے سرحدی ریاستوں کا دورہ کیا اور مجلس دستور ساز میں فرمایا کہ مظالم کی داستانیں فرضی ہیں۔ یہ داستانیں حقیقی ہوں یا فرضی۔ یہ حقیقت ہے کہ ریاستی نظامِ حکومت کو جمہوری بنانے میں مرکزی حکومت نے کوئی سرگرمی نہیں دکھائی، گو وزیرِ اعظم پاکستان نے فرمایا ہے کہ حکومت ریاستی نظامِ حکومت کو صوبوں کے برابر دیکھنے کی متمنی ہے۔ ایسا کب ہوگا؟ پاکستان کا آئین بن جائے گا تو ریاستیں خود بخود اس کی تتبع کریں گی!

مسلم لیگ

مسلم لیگ کا دعویٰ ہے کہ اس نے منتشر مسلمانانِ ہند کو ایک مرکز پر جمع کر دیا۔ ایک حد تک یہ دعویٰ صحیح ہے۔ لیکن بنظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ کمال مسلم لیگ کا جماعتی کارنامہ نہیں، بلکہ یہ معجزہ ہے صرف ایک ذاتِ گرامی یعنی قائدِ اعظم کا ــــ اللہ ان کے مرقد کو نور اور رحمت سے معمور رکھے ــــ جن کے بے لوث عمل، دیانت اور صداقت نے ملت کا کارواں مرتب کیا اور اسے پاکستان تک پہنچا کے دم لیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب قائدِ اعظم کی تمام تر توجہات استحکامِ پاکستان پر مرکوز ہو گئیں ـ اور ایسا ہونا بھی چاہئے تھا ــ اور مسلم لیگ قائدِ اعظم کی قیادت سے محروم ہو گئی تو مسلم لیگ کی سیاست نے شرمناک پلٹا کھایا۔ اربابِ لیگ ملی مطالبات کی نئی ذمہ داریوں سے تمام تر بے پرواہ ہو کر ذاتی مناصب اور اجاروں کے حصول و استحکام میں دیوانہ وار مصروف ہو گئے۔ لوٹ کھسوٹ کی اس افراتفری کا نتیجہ اندرونی خلفشار، بھگدڑ، تشتت کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ مسلم لیگی لیڈروں کو انتخابات میں کامیاب کرانے والے اور ان کے لئے "زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے لگانے والے طرح طرح کے امراض کا شکار ہو کر اور معمولی دوائیاں میسر نہ آسکنے کے باعث جان بحق ہونے لگے۔ وہ مظلوم و ستم رسیدہ کراہتے جاڑے میں گلیوں میں اور سڑکوں پر ٹھٹھر ٹھٹھر کر مرتے رہے اور انھیں

ایک کیبل یار رضائی تک نصیب نہ ہو سکی۔ انھوں نے فاقوں سے جان دی۔ ان کے بچے تڑپ تڑپ اور بلک بلک کر بھوک اور پیاس سے دائمی نیند سو گئے۔ یہ تھے پاکستان کے نام پر ووٹ دینے والے! ادھر پاکستان کے نام پر ووٹ لینے والوں کی نفسا نفسی۔ یہ عہدہ سنبھالو۔ اس کرسی پر قبضہ کرو۔ ان اکڑی، مشت استخواں لاشوں کے اوپر سے گزر جاؤ ـــــ اور وہ فیکٹری الاٹ کراؤ۔ وقت کم ہے، بھاگو ـــــ دوڑو!

اس بھاگ دوڑ میں نمائندگانِ مسلم لیگ نے صوبائی وزارتیں مرتب کیں، جو بتدریج ذاتی تغلب اور شخصی ہوس رانیوں کا اکھاڑہ بن گئیں۔ دیرینہ مخلص کارکن جماعت سے کٹنے لگے۔ نئے ابنائے وقت خالی نشستوں پر متمکن ہوتے گئے۔ اس پس منظر میں پاکستان مسلم لیگ معرضِ وجود میں آئی جس کی تنظیم کیلئے چودھری خلیق الزماں ہندوستان میں اپنا مستقبل قربان کر کے بھاگے بھاگے پاکستان آئے۔ ان کی خدمات از اول تا آخر اس نہج کی تھیں کہ صدارت کے بار کے لئے ان سے زیادہ قوی کندھے میسر نہ آ سکے۔ اندرونِ ملک مسلم لیگ کے کارناموں کی فہرست شرمناک ہے۔ سرحد، مغربی پنجاب، سندھ، بلوچستان، مشرقی بنگال۔ تمام حصص ملک میں ایک ہی داستان دہرائی جا رہی ہے۔ کردار مختلف ہیں، نفسِ ڈرامہ ایک ہے۔ صوبائی صدارتیں اور وزارتیں متحاصم گروہوں کے تصرف میں ہیں جن کا اصول کا رفاقت کی بجائے مخالفت ہے۔

مسلم لیگ کو فخر ہے کہ حکومت، مرکز اور صوبوں میں، اس کی مرتب کردہ ہے۔ لیکن وزارتوں کی ترتیب و تخریب جماعت کے ہاتھوں میں نہیں۔ نہ کسی اصول یا پروگرام کے تحت ہے۔ قائدینِ وزارت اپنے اپنے ہنگامی مفاد کے مطابق جماعت اور عوام کو بالکلیہ نظر انداز کر کے وزارتوں میں ردوبدل کرتے رہتے ہیں۔ صوبائی لیگیں صوبائی معاملات سے پہلوتہی کر کے مرکزی معاملات میں براہِ راست دخیل ہو رہی ہیں۔ اس طرح نہ صوبائی معاملے طے ہوتے ہیں نہ مرکزی مسائل حل ہوتے ہیں۔ غرض نہ مرکزی لیگ اور صوبائی لیگوں کا مطلوبہ باہمی ربط باقی ہے، نہ لیگ اور حکومت کے مابین کوئی جمہوری تعلق ہے۔ مرکزی حکومت کی ایک پالیسی ہے جس کے مطابق مرکزی اور صوبائی حکومتیں مصروفِ کار ہیں۔ مسلم لیگ کو نہ کبھی پروگرام سے سروکار رہا ہے، نہ پاکستان میں اسے کوئی پروگرام مرتب کرنے کی مہلت ہی مل سکی ہے۔ بلاخوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلم لیگ کا جماعتی نظام معطل ہو گیا ہے۔ جو شخص اٹھتا ہے وہ مسلم لیگ کے نام پر یا اس نام سے جو جی میں آتا ہے کہہ جاتا ہے یا کر گزرتا ہے۔ بعض صوبوں میں مسلم لیگ ہی کے پرانے کارکن عوامی لیگ کے نام پر متوازی مسلم لیگ قائم کر چکے ہیں۔ عوام کے نمائندے کون ہیں؟ اس کی کسے پروا۔ انتخابات آئیں گے تو سب ہی نمائندگی کا دم بھرنا شروع کر دیں گے اور دل کھول کر بے شعور عوام کو الو بنائیں گے۔

بعض سنجیدہ حلقے بدلے ہوئے حالات میں مسلم لیگ، بلکہ کسی جماعت کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ مسلم لیگ کا تسفل ان کے نزدیک ایک اور دلیل ہے کہ اس خطرناک گروہ کو ختم کر دیا جائے۔ ملت فی ذاتہٖ ایک جماعت ہے جسے ہنگامی اور پیش پا افتادہ مفادات

کی خاطر گروہوں اور پارٹیوں میں بٹ کر اپنی مجموعی قوت زائل نہیں کر دینی چاہیے۔ جن حضرات کی تقدیریں مسلم لیگ سے وابستہ ہیں، یا وہ محرومین جو کامیاب ابنائے وقت کو دیکھ دیکھ کر اپنی ناکامیوں کو کامرانیوں میں بدلنے کا واحد ذریعہ مسلم لیگ کو سمجھتے ہیں وہ اصولی استدلال سے کہاں قائل ہو سکتے ہیں اور اس پُر منافع کاروبار کو کیسے بند کر سکتے ہیں؟ مسلم لیگ کا ایک پارٹی کی حیثیت سے قیام ہی مخالفینِ لیگ کے لئے دعوتِ جماعت بندی ہے۔ ایک طرف اسی کے کارکنوں نے علیحدہ اور متوازی مسلم لیگ قائم کر لی ہے۔ دوسری طرف ہندوستان میں جن پارٹیوں اور جماعتوں نے مسلم لیگ کے ہاتھوں شکستیں کھائی تھیں وہ جذبۂ انتقام میں دیوانی ہو کر نئے مسائل کی آڑ لے کر تخریب میں مصروف ہیں۔ پنجاب میں اسمبلی کے تعطل اور نئے انتخابات کے اعلان نے ایسی جماعتوں کی سرگرمیوں کو تیز تر کر دیا ہے اور وہ بھیس بدل بدل کر معرکۂ انتخاب کے لئے تیار ہو رہی ہیں۔ مسلم لیگ نے غفلت اور حماقت سے جو فضا اپنے خلاف پیدا کر لی ہے یہ نئی جماعتیں اسے اپنے لئے مفید مطلب بنا رہی ہیں۔ غرض ایک ہمہ گیر گرداب ہے جس کے بے رحم چکروں میں ملت کی کشتی ڈگمگا رہی ہے۔

درونِ خانہ یہ ہنگامے ہیں اور پاکستان مسلم لیگ کے صدر، چودھری خلیق الزمان، قرآن کو نیزے پر لٹکائے پاکستان کی قیادت محفوظ کر لینے کے بعد عالمِ اسلامی کی قیادت کے غم میں در بدر کی خاک چھان رہے ہیں۔ انہیں عرب لیگ کی ہیئت پر اعتراض ہے کیونکہ وہ عوام کی نمائندہ نہیں اور عالمِ اسلامی کو ایک عوامی جماعت کی ضرورت ہے۔ دماغ کی اس اپج کو اسلامستان کا نام دیکر چودھری صاحب نے اس کی ڈگڈگی کراچی سے لندن تک بجائی۔ ان کے "تماشائیوں" پر نگاہ ڈالئے تو حکام اور سرکاری عہدیداروں کے علاوہ کوئی نظر نہیں آئے گا۔ عالمِ اسلامی میں بالعموم اور ممالکِ عربی میں بالخصوص وہ جمہوری طرزِ حکومت رائج نہیں جس میں عوامی جماعتیں تشکیل پذیر ہو کر کاروبارِ حکومت میں دخیل ہوتی ہیں۔ خود پاکستان میں، جو ان ممالک سے بدرجہا بہتر حالت میں ہے، عوامی جماعتوں کا فقدان ہے۔ ایسے میں اسلامستان کا یہ تنہا شہری کس سے مل سکتا تھا؟ آپ نے ناچار حکامِ وقت سے ملاقاتیں کیں اور ان سرکاری تفریحات میں اسلامستان کی تشکیل کا فریضہ ادا کیا۔ دنیائے اسلام کی چار دیواری کو اسلامستانی پروپیگنڈہ کے لئے کافی نہ پاکر چودھری صاحب تیر کی تیزی کے ساتھ لندن پہنچے تاکہ اس اہم مرکز میں بعض نمایاں مرکزی تاروں کو ہلا سکیں۔ لندن میں برطانیہ کے استعماری اور خارجی وزارتوں کے سایہ میں "دیرینہ تعلقات" کو تازہ کیا گیا اور محبت کی پینگیں بڑھائی گئیں۔ الطاف حسین، جس کی ادارت میں شائع ہونے والا ڈان واحد اسلامستانی کا واحد — تا بہ حد غلو — نقیب تھا، اپنے ہیرو کی حرکات سے آپے سے باہر ہو گیا اور لندن سے بھیجے ہوئے افتتاحیہ میں یہ واویلا مچایا کہ خلیق الزماں مسلم لیگ کا صدر ضرور ہے لیکن اس کا اسلامستان نہ حکومتِ پاکستان کی تائید سے ہے، نہ اسے اس پروپیگنڈہ میں مسلم لیگ ہی کی سند حاصل ہے۔ وہ خلیق الزماں جس کے دورہ کے ساتھ ساتھ یہ پروپیگنڈہ کیا جاتا تھا کہ وہ اس پاکستان مسلم لیگ کا صدر ہے جس کی حکومتیں مرکز اور صوبوں میں چل رہی ہیں۔ اسی خلیق الزماں سے آج یوں بے تعلقی کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ یہ سب کچھ اس کا ذاتی فعل ہے۔ اس کے ساتھ ہی چودھری صاحب کو بھی انتباہ کیا گیا کہ برطانوی حکام سے مل کر انہوں نے اپنے حدود سے تجاوز کیا ہے۔

جمہوریت اور سیاسی احزاب کے گہوارے لندن میں بیٹھ کر برطانیہ کو یہ بتانا کہ پاکستان کی وہ واحد سیاسی جماعت مسلم لیگ جس کی حکومتیں پاکستان بھر میں برسرِ اقتدار ہیں۔ اس کے صدر کا وہ دورہ جسے پاکستان کا نیم سرکاری اخبار ڈان روزانہ اپنے صفحات میں اچھالتا رہا ہے اور قدم قدم پر اس کا ساتھ دیتا رہا ہے، بالکل انفرادی حیثیت رکھتا ہے اور اس سے ڈان، مسلم لیگ اور حکومتِ پاکستان کا کوئی تعلق نہیں، کسی الطاف ہی کا کام ہو سکتا ہے!

چودھری خلیق الزماں صاحب بظاہر تو خاموش رہے اور اس بجٹ کو آگے نہیں بڑھنے دیا، لیکن درپردہ اس کا منہ توڑ جواب تیار کرنے میں معروف رہے۔ چنانچہ دسمبر کے آخر میں پاکستان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے آپ کی اسلامستان سے متعلق مساعی کی تعریف کی۔ اس اجلاس میں ڈان کے رویہ کی مذمت کی قرارداد بھی منظور ہو جاتی، مگر اخبارات کے بیان کے مطابق لیاقت علی خاں کی مداخلت سے رہ گئی۔ بہرحال یہ قرارداد منظور کر کے مسلم لیگ نے اسلامستان کی تحریک کو اپنا لیا ہے۔ کیا لیگ کے اس جلسہ میں وزیراعظم پاکستان کی موجودگی سے اسے سرکاری سند بھی حاصل ہو گئی ہے؟

عالم اسلامی اسلامستان کے ذکر سے خود بخود توجہ عالم اسلامی کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ مسلمانانِ ہندوستان کو عالم اسلامی سے جذباتی وابستگی رہی ہے اور انھوں نے اپنے معاملات سے بڑھ کر برادرانِ اسلام کے معاملات میں دلچسپی لی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی زمین کے ہنگاموں کو کبھی سہل نہ سمجھا اور وفورِ جذبات سے ممالکِ اسلامیہ کے اندیشوں میں مستغرق رہے۔ انیسویں صدی کی ضربات پیہم نے عالم اسلامی کی ظاہری وحدت کو پارہ پارہ کر دیا۔ بیسویں صدی کا ربع اول عالم اسلامی کے لئے کشمکش حیات کا نازک ترین دور تھا۔ اس دوران میں مسلمانانِ عالم غیر معمولی حوادث کا شکار رہے۔ مسلمانانِ ہندوستان کے نزدیک المناک ترین حادثہ الغائے خلافت تھا۔ ہر چند ترکوں نے غایت ہوشمندی اور تدبر سے اس ردا کو اتار پھینکا، اس کی دھجیاں باہمہ تقدس اقطارِ عالم اسلامی میں حرزِ جاں بنا لی گئیں۔ کئی سینے امارت و خلافت کی بے تاب تمناؤں کی آماجگاہ بنے۔ عربی ممالک کی سیاست آج بھی انہی مخفی خواہشات کا پرتو ہے۔ پاکستان بن جانے سے یہاں بھی بعض پہلوؤں میں اس تمنا نے چٹکی لی۔ جذبات کا بالکل عامیانہ مظاہرہ کرتے ہوئے قیادت عالم اسلامی کی گفتگو بے تکلفی سے ہونے لگی۔ سال کے آغاز میں کراچی میں ایک غیر سرکاری موتمر اسلامی طلب کی گئی۔ جذبات پر استوار عمارت حوادث روزگار کا کیا مقابلہ کر سکتی ہے نشستند و گفتند و برخاستند والا معاملہ ہوا اور بات آئی گئی ہو گئی۔ اسلامستان اسی قبیل کا سیاسی اقدام ہے، لیکن اس کی اساس ٹھوس سیاسی حقائق نہیں، بالکل سطحی مذہبیانہ جذبات ہیں جن پر سیاست کی ملمع کاری کر دی گئی ہے۔ چنانچہ ابتداً خود چودھری صاحب نے قیادت عالم اسلامی کا ذکر شروع کیا، اور جب بعض غیر ملکی حلقوں سے اس ہوسِ قیادت کی دبی زبان سے مخالفت بلند ہوئی تو آپ نے معذرت خواہانہ انداز میں اس کی توجیہ شروع کر دی۔ اس قبیل کی

قابلِ قدر کوشش بین الاقوامی اقتصادی کانفرنس ہے جو حال ہی میں کراچی میں منعقد کی گئی۔ گو اس میں بھی کہیں کہیں سطحی جذبات سے چھینٹے نظر آتے تھے لیکن یہ کوشش فی الجملہ مستحسن ہے۔ اس کانفرنس میں پہلی مرتبہ ممالکِ اسلامیہ کو غیر جذباتی دعوت پر جمع کرنے کی کوشش کی گئی اور مشترک مسائلِ اقتصادی کا جائزہ لے کر تعاون و رفاقت کی راہیں سوچی گئیں۔ یہ مساعی ابتداً کتنی حقیر کیوں نہ ہوں خوش آئند ہیں کیونکہ عالمِ اسلامی جب تک اپنے ماحول و مسائل کا غیر جذباتی تجزیہ کرنے کا اہل نہیں ہو جائے گا وہ قومی ہمسایوں کا صیدِ زبوں رہے گا۔

کون انکار کر سکتا ہے کہ پاکستان اور ترکی کو چھوڑ کر دیگر تمام بلادِ اسلامی ملوکیت کی لعنت میں گرفتار ہیں۔ ملوکیت حسنِ انتظام سلطنت بھی اپنے ساتھ رکھے تو بھی تمام آیۂ رحمت نہیں ہو سکتی۔ یہ بہرصورت حاکمیت ہوگی۔ جو محکوم اور محکومی کو مستلزم ہے مسلمانوں کے بیشتر ملوک مطلق آمر ہیں۔ حکومتیں ان کے لئے شخصی اجارے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود دولِ عظمیٰ کی سیاستِ قوت کے چنگل میں گرفتار ہیں اور عوام درماندہ و تباہ حال ہیں۔ جہالت اور غربت عام ہے حالانکہ ان علاقوں کے معدنی ذرائع بے بہا ہیں۔ مشرقِ وسطیٰ کی سرزمین معدنی ذرائع کے علاوہ تیل کے بیش قدر ذخائر اپنے سینے میں رکھتی ہے۔ یہ قدرتی دولت شخصی آمریت میں متعلقہ ممالک کیلئے لعنت بن گئی ہے۔ ملوکیت نے ذاتی منافع کے عوض میں استعماریت کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ ہرچند ان ممالک میں علاوہ سیاسی شعور کا فقدان ہے، تاہم ان غلاموں کا خون بھی گرم ہونا شروع ہو گیا ہے۔ گو اس خون کو پورے جوش میں آنے کے لئے ابھی ایک عرصہ چاہیئے۔ جب تک یہ طلسمِ سامری پوری طرح ٹوٹ نہیں جاتا عالمِ اسلامی کی ترفیع و ترقی کے امکانات روشن نہیں ہو سکتے۔

یہ صحیح ہے کہ ممالکِ اسلامیہ میں مذہب کا اشتراک ایک ناقابلِ شکست رابطہ ہے۔ دنیائے اسلام کو یہی ایک واسطہ متحد یکجا کرنے کے لئے کافی ہونا چاہیئے، لیکن اندرونی طور پر مدعیانِ اسلام نے اور بیرونی طور پر سیاستِ افرنگ نے جس بری طرح اس دینِ فطرت کو ایک معمولی مذہب بنا کے رکھ دیا ہے اس کے پیشِ نظر موجودہ "اسلام" یا اسلام کا عام تصور حقیقی بنیاد کا کام نہیں دے سکتا۔ بحالاتِ موجودہ یہ اشد ضروری ہے کہ واقعات کو برای العین دیکھا جائے اور بیکار جذبات سے پہلوتہی کی جائے۔ جب تک اسلام کا حقیقی مفہوم واضح اور ذہن نشین نہیں ہو جاتا محض "اسلام" "اسلام" پکارنے سے خاطر خواہ نتائج مترتب نہیں ہو سکیں گے۔

عالمِ اسلامی کا مرکزی مسئلہ فلسطین ہے۔ فلسطین میں عربوں کی شکست کی وجہ نہ یہودیوں کی اعلیٰ عسکری تنظیم ہے، نہ ان کا وافر ساز و سامان۔ اس کی حقیقی وجہ عرب حکمرانوں کی باہمی رقابتیں ہیں۔ وہ مسئلہ فلسطین پر جمع ہوئے درآنحالیکہ ان کے دل پھٹے ہوئے تھے۔ مصر اپنی قیادت کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ فلسطین کے جنوبی علاقہ پر تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اردن اور عراق کا ہاشمی خانوادہ زیادہ طاقتور ہو جائے۔ اردن فلسطین کو اپنے تصرف میں لانے کا متمنی ہے۔ وہ اردن، فلسطین، شام اور عراق کو متحد کر کے ایک طاقتور ریاست بنانا چاہتا ہے تاکہ وہ بھی ابنِ سعود کا ہم پلہ ہو جائے اور قوت مجتمع کر کے اسے نیچا دکھا سکے۔ رقابتوں کے اس گھناؤنے کھیل میں عوام بارود کا چارہ اور آگ کا ایندھن بنے۔ اقوامِ متحدہ نے کوئی پانچ لاکھ "بے وطن" یہودیوں کو فلسطین

میں وطن عطا فرمایا اور کم و بیش دس لاکھ عربوں کو بے خانماں کر دیا۔ یہ مفلوک الحال اب تک مارے مارے پھر رہے ہیں اور کوئی ان کا پرسانِ حال نہیں۔ شاہ عبداللہ نے ان کی ایک کانفرنس منعقد کرا کے یہ فیصلہ کرا لیا کہ وہ فلسطین کا الحاق اردن سے چاہتے ہیں۔ دس لاکھ انسانوں کا یہ گروہ جانوروں کی طرح دن گزار رہا ہے بلکہ ان سے بھی بدتر۔ ان کے کیمپوں میں خوراک نہیں، بیماروں کے لئے دوا نہیں، کپڑے نہیں، صفائی کا انتظام نہیں، نیچے زمین ہے، اوپر آسمان! عربی سیاست نے لوزان کانفرنس میں سارا زور اس پر لگا دیا کہ یہودی ان تارکینِ وطن کو اپنے گھروں میں واپس لے لیں۔ یہودی اس پر رضامند نہیں ہوئے۔ وہ ہوتے بھی کیوں! وہ عربوں کو گھروں سے نہ نکالیں تو خود کہاں آباد ہوں؟ امریکہ، جس نے صدارت کے انتخاب میں یہودی ووٹ حاصل کرنے کیلئے یہ خونین کھیل کھیلا اور دنیائے عرب کے قلب پر یہودی ناسور پیدا کیا، عربوں کا ہمدرد بن کر جلوہ گر ہو رہا ہے۔ کلیپ (امریکن) کی قیادت میں ایک مشن تیار کیا گیا ہے جو مشرقِ وسطیٰ کا اقتصادی جائزہ لیکر مشورہ دے گا کہ فلسطینی پناہ گزینوں کو کہاں اور کیسے آباد کیا جا سکتا ہے۔ یہ مشن ان دنوں مصروفِ کار ہے۔

فرانس مشرقِ وسطیٰ سے بے دخل ہو چکا ہے۔ برطانیہ کے ناخن کہیں کہیں گڑے ہوئے ہیں لیکن وہ امریکی دباؤ کے سامنے زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا۔ امریکہ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں براہِ راست دخیل ہو کر انہیں اپنے حلقۂ اثر میں لا رہا ہے۔ فلسطین میں جس اسرائیلی حکومت کو وہ مسلط کر چکا ہے، اب اس کی انتہائی کوشش ہے کہ اس کڑوی گولی کو شکر میں لپیٹ کر عربوں کے حلق سے اتار دے۔ مشرقِ وسطیٰ کے تیل پر پوری طرح تسلط جمانے اور اسے اپنے مصرف میں لانے کے لئے اسے ان علاقوں میں امن کی ضرورت ہے۔ اردن اور عراق کی ہاشمی سلطنتیں انگریزی حلقۂ اثر میں ہیں۔ شام پر ہاشمیوں کی نگاہیں ہیں۔ اس بدقسمت ملک میں ایک سال کے اندر تین "انقلابات" برپا ہو چکے ہیں۔ بیٹھے بٹھائے ایک فوجی افسر اٹھتا ہے اور آنِ واحد میں کاروبارِ حکومت تہ و بالا کر کے خود مسلط ہو جاتا ہے۔ شام کا انجام کیا ہو گا؟ وہ بالآخر ہاشمی سلطنت کا ایک حصہ بن جائے گا یا آزادانہ زندگی گزار سکے گا، اس کا جواب وقت دے گا۔

افغانستان یعنی پاکستان کا قریبی ہمسایہ جس سے پاکستان کی ہمیشہ گہری وابستگی رہی ہے اور جس کی آزادی اور استقلال کی اس نے دامن پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگی ہیں وہ اندرونی مصائب سے پریشان ہو کر دشمنانِ اسلام کا آلۂ کار بنا ہوا ہے۔ وہ بدقسمتی سے دشمنانِ پاکستان کی صف میں ہے۔ سیاسی شعور کے اعتبار سے افغانستان سب سے زیادہ پسماندہ مسلمان ملک ہے۔ جب تک اس کے عوام باشعور ہو کر زمامِ اقتدار ہاتھ میں نہیں لے لیتے اس بدقسمت ملک کی تقدیر نہیں پلٹ سکتی۔

یہ سال دنیائے اسلام کو ایک حقیقی تحفہ دیئے جا رہا ہے۔ انڈونیشیا، جو گذشتہ عالمگیر جنگ کے بعد جنگِ حریت کی فیصلہ کن منزل میں آ پہنچا تھا، آزاد و خود مختار ہو گیا ہے۔ ۲۷ دسمبر کو ریاستہائے متحدہ انڈونیشیا کا قیام عمل میں آیا اور اسی روز پاکستان نے اسے تسلیم کر لیا۔ آزاد انڈونیشیا پائندہ باد! آزادی نے انڈونیشیا پر صرف ملکی تعمیر کی گراں بار ذمہ داری نہیں ڈالی بلکہ اس پر ایشیا، عالمِ اسلامی بلکہ انسانیت کی تقدیر نو کی تشکیل کی ذمہ داری بھی عائد ہو گئی ہے۔ اقوامِ عالم اس کی اٹھان کو دلچسپی سے دیکھیں گی۔

شرق و غرب مشرق و مغرب کی کشمکش نازک دور میں داخل ہوتی جا رہی ہے۔ اس سال کے آخر میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کا جو اجلاس ہوا اس کے متعلق قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں کہ روس اور امریکہ کو قریب تر لانے کی کوشش کی جائیگی۔ عملاً یہ توقعات عبث ثابت ہوئی ہیں۔ امریکہ نے اب تک ایٹم بم کو صیغہ راز میں رکھا اور روس کا مطالبہ یہ رہا کہ ایٹم بم کو بالکل ممنوع قرار دے دیا جائے اور دولِ عظمیٰ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کریں۔ جنرل اسمبلی کے اجلاس سے پیشتر صدر ٹرومین نے یہ انکشاف کیا کہ روس کے پاس بھی ایٹم بم موجود ہے۔ روسی نمائندے نے اس انکشاف کے باوجود اپنے سابقہ مطالبات پر قائم رہنے کا خیال ظاہر کیا۔ مگر کوئی مفاہمت نہیں ہو سکی۔ امریکہ میں عام اندازِ گفتگو اب تک یہ تھا کہ تیسری جنگِ عظیم کو کیسے روکا جائے۔ اب یہ انداز بدل رہا ہے اور عام انداز یہ ہوتا جا رہا ہے کہ تیسری جنگ میں فتح کیسے حاصل کی جائے۔ یورپ اور بلقان مشرق و مغرب کی زد میں آ چکے ہیں۔ چنانچہ جرمنی کو کوئی باہمی تصفیہ نہ ہو سکنے کی صورت میں دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ جاپان پر بدستور امریکہ مسلط ہے اور اس کے معاہدہ امن پر مفاہمت نہیں ہو سکی۔ مشرقِ وسطیٰ اور ایشیا اس کشمکش کی زد میں آتے جا رہے ہیں۔ چین نے پانسہ پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ برما، ہند چینی، ویٹ نام، سیام، بلکہ ہندوستان پر چین کے سرخ انقلاب کا نمایاں اثر پڑے گا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ خود پاکستان ان اثرات سے کس حد تک محفوظ رہ سکے گا۔ مشرقی بنگال کے حالات اب تک تسلی بخش نہیں رہے۔ گو اب وہ روبہ اعتدال نظر آتے ہیں۔ پاکستان کی اقتصادی حالت غیر مستحکم نہیں، اس لئے یہاں کمیونزم کا فوری خطرہ نہیں۔ یوں بھی مسلمانانِ پاکستان کو اسلام سے جو وابستگی ہے وہ انہیں کمیونزم سے دور رکھے گی۔ لیکن اس حقیقت کا انکار مشکل ہے کہ پاکستان ایک غریب ملک ہے اور اس کا معیارِ زیست پست ہے۔ پاکستان کو لامحالہ تیز گامی سے صنعتی ترقی کرنی پڑے گی۔ صنعتی ترقی اپنے جلو میں سرمایہ اور محنت کی تزاع لائے گی۔ اگر یہاں بھی سرمایہ اور محنت میں تباین ہی رہا اور ان میں رفاقت نہ ہو سکی تو پاکستان کمیونزم کا شکار ہو کر رہے گا۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ ابھی سے صنعتی پالیسی کی نگہداشت کرے اور ملک کو سرمایہ دارانہ نظام کی لعنتوں سے بچائے رکھنے کی فکر میں رہے۔ اگر مزدور دل خوش اور مطمئن نہ ہو سکے تو صنعتی ترقی رحمت کی بجائے زحمت بن جائے گی، جیسا کہ ہر جگہ ہوا ہے۔

پاکستان کی جغرافیائی اہمیت کا روس اور امریکہ دونوں کو احساس ہے۔ چنانچہ روس نے وزیرِ اعظم پاکستان کو روس آنے کی دعوت دے رکھی ہے۔ حال ہی میں پاکستانی سفیر شعیب قریشی۔ عازمِ روس ہو گئے ہیں۔ روسی سفیر مقرر ہو چکا ہے۔ اس کے پاکستان آ جانے کے بعد وزیرِ اعظم پاکستان کے روسی سفر کا پروگرام تیار ہو گا۔ صدر ٹرومین نے بھی وزیرِ اعظم پاکستان کو امریکہ آنے کی دعوت دیدی ہے۔ آپ آئندہ مئی میں امریکہ تشریف لے جا رہے ہیں۔ قیاس کیا جا رہا ہے کہ شاید آپ براستہ ماسکو واشنگٹن جائیں۔ نہرو نے امریکی سفر میں متعدد مرتبہ یہ اعلان کیا کہ ہندوستان مشرق و مغرب کے متحالف حریفوں میں سے کسی کا بھی ساتھ نہیں دیگا اور عالمگیر امن کے لئے کوشاں رہے گا۔ امریکہ میں بیٹھ کر روس پر نگاہ رکھتے ہوئے الفاظ سے فریقین کو خوش کرنے کی کوشش قابلِ فہم ہے، لیکن عملاً خارجہ پالیسی کو بیک وقت ان دو حریف کیمپوں سے مطابق بنانا محال ہے۔ ہندوستان کی حالت یوں بھی دگرگوں ہے اس کے عوام کا معیارِ زیست

پست ہے اور اس کا نظامِ حکومت سرمایہ دارانہ ہے۔ اس کے ہاں سرمایہ و محنت کی کشمکش اس منزل میں بھیانک طور پر داخل ہو چکی ہے جبکہ محنت کشوں کی ہر حرکت انھیں کمیونزم کی طرف لے جاتی ہے۔ ایسے میں مزدور روس کی طرف آنکھیں لگائے ہوئے ہیں اور سرمایہ داروں کا جھکاؤ قدرتی طور پر امریکہ کی طرف ہے۔ غذائی خسارہ اور غیر موافق توازنِ تجارت نے اس کے نظامِ معیشت کو متزلزل اور ناہموار کر رکھا ہے۔ ان حالات میں ہندوستان کی حکومت کے لئے ناممکن ہے کہ وہ دنیا کے دو طاقتور حریفوں میں توازن قائم رکھ سکے۔ پاکستان کی حالت اس سے مختلف ہے۔ ترکی کی مثال اس کے سامنے ہے۔ گذشتہ جنگ میں ترکی اتحادیوں اور محوریوں جیسی خوفناک طاقتوں میں محصور رہا۔ ترکی کسی ایک حریف کا بھی مدمقابل نہیں ہو سکتا تھا لیکن اربابِ سیاست نے جس حسنِ تدبر اور کمال دانشمندی سے ان دو حریفوں کے درمیان توازن قائم رکھا وہ بیسویں صدی کا معجزہ ہے۔ پاکستان جرأت اور تدبر سے کام لے تو اپنی خارجی حکمت عملی کو ایسی راہوں پر ڈال سکتا ہے جو اسے ان خارزاروں سے بچا کر منزلِ مقصود تک پہنچا دیں۔

ذرائع رسل و رسائل کی فراوانیوں اور اسبابِ مواصلات کی وسعتوں نے زمین کی طنابوں کو کھینچ کر تمام کرۂ ارض کو ایک بستی بنانا شروع کر دیا ہے۔ اس سے مختلف غیر فطری حدود و ثغور جو انسانوں کو انسانوں سے الگ کئے ہوئے تھیں، ایک ایک کر کے گرتی جا رہی ہیں۔ یہ تمام عنوانات اسی منزل کے لئے دلیلِ راہ بن رہے ہیں جسے قرآن نے بہت پہلے وحدتِ انسانیت کے نام سے پکارا تھا۔ لیکن ان طبیعی حدود کے مٹنے کے باوجود، انسانوں نے اپنی خود ساختہ حدود کو ابھی تک نہیں مٹایا اور انسانوں کے اجسام و ابدان کے قریب تر ہونے کے باوجود، ان کے قلوب ایک دوسرے سے اسی طرح دور ہیں۔ (تحسبھم جمیعاً وقلوبھم شتّٰی) دلوں کا قرب اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب انسان اس اصل الاصول کو اپنے سامنے لائے جس پر وحدتِ انسانیت کی بنیاد استوار ہے۔ اور یہ اصل الاصول وحی کی روشنی کے بغیر سامنے آ نہیں سکتا۔ لہٰذا اب زمانے کے تقاضے بشدت پکار رہے ہیں کہ کوئی اسس بنائے وحدتِ انسانیت کو مشہود سامنے لائے۔ فضلائے عالم، قرآنی دعوت کے لئے از خود سازگار ہو رہی ہے۔ ہر جانے والا سال آنے والے سال کے کان میں یہی کچھ کہہ کر جاتا ہے۔ لیکن یہ دعوتِ قرآن اسی صورت میں مشہود سامنے آ سکتی ہے جب اسے کسی ایک خطۂ زمین میں عملاً متشکل کر دیا جائے۔ پاکستان فرنگی استبداد کی لعنت سے اڑھائی برس اُدھر رہا ہوا۔ انڈونیشیا کے پانچ چھ کروڑ مسلمانوں کے گلے سے یہ طوقِ لعنت اب اترا ہے۔ انہی دو سرزمینوں کی طرف تمام نوعِ انسانی کی آنکھیں لگ رہی ہیں۔ دیکھیں واشرقت الارض بنور ربھا (زمین اپنے رب کے نور سے جگمگا اٹھی) کی تفسیر کس کے حصہ میں آتی ہے۔

آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے مسکیں ولکم ماندہ دریں کشمکش اندر

باب المراسلات

۱۔ انتخابات

دسمبر کے طلوعِ اسلام میں ہم نے ایک پمفلٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ موجودہ طریق انتخابات میں ایسی اصلاح ضروری ہے جس سے قوم کا چھوٹا طبقہ بھی ایک موثر عنصر بن سکے۔ اس ضمن میں صوبہ سرحد سے ہمیں ایک خط موصول ہوا ہے جسے درج کیا جاتا ہے۔ یہ ایک رائے ہے جس سے ہر شخص کا (حتیٰ کہ طلوعِ اسلام کا بھی) متفق ہونا ضروری نہیں۔ بایں ہمہ ہم اس خط کو شائع کر رہے ہیں تاکہ اس طرح باہمی مشاورت سے اگر کوئی بہتری کی صورت نکل آئے تو اس سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ اس باب میں اگر کوئی اور صاحب بھی اپنے سامنے کوئی اصلاحی تجویز رکھتے ہوں تو ہمیں مطلع فرمائیں۔ تحریر میں اختصار کو پیشِ نظر ضرور رکھئے۔]

آپ نے دسمبر ۱۹۴۹ء کے طلوعِ اسلام کے صفحہ ۸۰ پر میر حضرت شاہ صاحب ایڈووکیٹ کیمبل پور سے خطاب فرمایا ہے، اور اُن سے درخواست کی ہے کہ یہ مزارعے اور چھوٹے مالک "موجودہ قانون" کا کس طرح مقابلہ کریں: اور لکھا ہے کہ اگر وہ اس مشکل کا کوئی عملی حل سوچ سکتے ہیں تو اسے سامنے لائیں۔

اس ضمن میں یہ عرض ہے کہ جیسا کہ آپ اکثر طلوعِ اسلام میں لکھا کرتے ہیں کہ اصلی حل تو اسلامی قوانین کا نفاذ ہے، اور اس کیلئے بقول آپ کے بیس پچیس سال تک نئی نسل کو اسلامی رنگ میں رنگنا ہے تب جا کر کہیں یہ امید ہو سکتی ہے کہ شاید یہ نظام بدل سکے لیکن بحالاتِ موجودہ اس مشکل کا حل میرے خیال میں ایک ہے، جو میں ذیل میں عرض کرتا ہوں۔ اگر موجودہ قانون میں تھوڑی سی ترمیم کر دی جائے تو کچھ نہ کچھ ازالہ ہو سکتا ہے اور وہ اس طرح کہ حکومتِ پاکستان پر زور ڈالا جائے کہ وہ اس موجودہ (انگریزی جمہوریت کے) طریقِ انتخاب اور حلقہ ہائے نیابت کو تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ تبدیل کر دے۔ حلقہ ہائے نیابت کا موجودہ طریق سراسر غلط ہے۔ آپ جس حلقۂ انتخاب کو لے لیں کیا کبھی کسی کے تصور میں یہ بات آ سکتی ہے کہ اس حلقہ سے کبھی کوئی غریب شخص اسمبلی کا ممبر بن سکتا ہے، خواہ اس غریب شخص نے قوم کیلئے کتنی قربانیاں کیوں نہ کی ہوں؟ اسمبلی میں جو لوگ آج کل پہنچے ہیں وہ سب کے سب سرمایہ دار ہوتے ہیں۔ انھیں عوام کو طرح طرح سے بیوقوف بنا کر یا دوستی یا رشتہ داری اور ہمسائگی کا واسطہ دے کر یا ڈرا دھمکا کر یا رشوت دے کر ووٹ حاصل کرنا پڑتا ہے۔ ایسی اسمبلی میں پھر جس قسم کے قوانین بنتے ہیں وہ سب انھیں (سرمایہ دار) لوگوں کے مفاد سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس خرابی کے ازالہ کے لئے میری ناچیز رائے یہ ہے کہ:۔

"زمین کے حلقے" بنانے کے بجائے "لوگوں کے حلقے" بنائے جائیں۔ لوگوں کے حلقوں سے مراد میری یہ ہے کہ لوگوں کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا جائے۔ مثلاً "لینڈ لارڈز طبقہ"۔ "درمیانی طبقہ"۔ "غریب مزدور کسان طبقہ"۔ "یونیورسٹی کی سیٹ"۔ "کامرس کی سیٹ"۔ "ٹریڈ یونین کی سیٹ"

"اساتذہ کی سیٹ" "اہلکاروں کی سیٹ" "فوجیوں کی سیٹ" "عورتوں کی سیٹ" وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح جو اسمبلی بنے گی اس میں سب "طبقات" کے لوگوں کی نمائندگی ہوگی۔ اس قسم کی اسمبلی میں کوئی پارٹی دوسری پارٹی پر غالب نہیں آسکے گی۔ وزارت میں بھی مشترک نمائندگی ہوگی اور کسی فرقے کو یہ شکایت نہ ہوگی کہ ان کی نمائندگی پوری طرح نہیں ہو رہی۔

اب دوسرا سوال یہ ہے کہ ووٹ کا حقدار کون ہو۔ عام رجحان یہ ہے کہ ووٹ ہر ایک بالغ مرد و عورت کو دینا چاہئے۔ معاف فرمائیے، میں اس اصول سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ میرے خیال میں اس طرح کا عام حق دینے کا یہ مطلب ہوا کہ ایک گریجویٹ اور ایک اَن پڑھ جاٹ کے ووٹ میں کوئی تمیز نہ ہوگی۔ اور وہ دونوں یکساں درجے میں خیال کئے جائیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ شہریت کے حقوق دونوں کو یکساں طور پر حاصل ہیں۔ لیکن ایک زمیندار ان پڑھ آدمی سے آپ ووٹ کے صحیح استعمال کی کبھی توقع نہیں رکھ سکتے۔ اس لئے اگر ووٹ کے حقدار بننے کے لئے تعلیم کی شرط لازمی کر دی جائے تو اس سے بلا واسطہ یہ فائدہ ہوگا کہ سب لوگ تعلیم حاصل کرنے کے درپے ہو جائیں گے آخر "غریب مزدور و کسان طبقہ" کی نمائندگی بھی تو ایک تعلیم یافتہ ممبری کر سکے گا نہ کہ اَن پڑھ۔ اس طرح تھوڑے عرصہ میں تعلیم یافتہ لوگوں کی اوسط بڑھ جائے گی۔ پس غیر تعلیمیافتہ شخص کو ووٹ کا حق دینا اگر گناہ نہیں تو زیادتی ضرور ہے۔ دیہات میں مردوں کو کم از کم مڈل پاس اور شہروں میں میٹرک پاس اور عورتوں کے لئے دیہاتوں میں پرائمری پاس اور شہروں میں مڈل پاس کو ووٹ کا حق دینا چاہئے۔ تاکہ آبادی کا نصف حصہ (صنفِ نازک) بھی زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو جائے۔

اسی کے ساتھ ساتھ ووٹر بننے کے لئے چند ایک مخصوص حالات میں رعایات مقرر کرنے سے جب غیر تعلیمیافتہ لوگ اپنی غیر تعلیمیافتگی کے سبب سے بہت سی دنیوی رعایات سے محروم رہیں گے، تو تعلیم بالغان کا سلسلہ بھی شروع ہو جائے گا۔ لوگ نہ صرف خود تعلیم بالغان کی طرف توجہ دیں گے بلکہ اپنے بچوں اور بچیوں کو بھی تعلیم سے آراستہ کرلیں گے۔ اس ضمن میں ووٹر کے لئے استثناء کی صورتیں حسب ذیل ہو سکتی ہیں:۔ فوجی سپاہی (خواہ وہ ان پڑھ ہی ہو)۔ پولیس مین۔ نیشنل گارڈ کا سپاہی یا والنٹیر۔ تعلیم بالغان کے سکول کا سند یافتہ دایہ اور نیشنل گارڈ میں بھرتی شدہ عورت وغیرہ۔

کرایہ مکان یا جائداد کی بنا پر یا غیر تعلیم یافتہ دوسرے قسم کے ملازمین سرکار کو ووٹ کا حق ہرگز نہیں دینا چاہئے۔

یہ جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس کی ابتدا مسلم لیگ کی ابتدائی کمیٹیوں کے انتخاب سے ابھی سے شروع کی جا سکتی ہے، تا آنکہ آگے جا کر یہ طریقہ پاکستان کے باقاعدہ آئین کا جزو قرار دیا جائے۔

ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے، اور وہ یہ کہ اب تک مسلم لیگ کی تنظیم کے سلسلے میں ابتدائی کمیٹیوں کے انتخابات میں عورتوں کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے، اور آبادی کے صرف نصف طبقے کی نمائندگی ہو رہی ہے۔ صحیح جمہوری اصول کے مطابق عورتوں کی نمائندگی ان کے تناسب کے لحاظ سے بے حد ضروری ہے۔ عورتوں کے لئے ووٹ صرف عورتیں ہی دیں۔ ابتدائی مسلم لیگ کمیٹیوں میں بھی اور اسمبلی کی

امیدوار عورت کے لئے بھی کسی صورت میں مخلوط انتخاب نہ ہو۔

اب رہا یہ سوال کہ ایسی اسمبلی میں جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے کس قسم کے امیدوار کو ووٹ دیا جائے۔ تو یہ تو ظاہر ہے کہ جس شخص نے اپنی گذشتہ زندگی میں کوئی قومی کام بے لوث طریق سے (محض قوم کی خاطر) کئے ہوں وہ تو سب لوگوں کو اظہر من الشمس ہوگا اور وہ ہمیشہ بلا مقابلہ ہی منتخب ہوا کرے گا۔ البتہ اسے جہاں تک ہو سکے قرآن کے علم کی واقفیت ضروری حاصل ہو۔ اور اقتصادیات میں بھی تھوڑا بہت ماہر ہو۔ اگر وہ دنیا کی سیاسیات حاضرہ پر عبور رکھتا ہو اور اسلامی تاریخ سے بھی واقف ہو تو نور علیٰ نور بہتر ہوگا کہ اسمبلی کے امیدوار کیلئے شرائط میں ایسی باتیں مخصوص کر دی جائیں جو ایک ممبر کے لئے لازمی طور پر حاصل ہوں اور وہ اسمبلی میں صرف ہاتھ اٹھانے والا ممبر نہ ہو، بلکہ اپنی رائے کا واحد مالک ہو۔

(جی۔ ڈی۔ صابر۔ مردان)

۲۔ اقتصادی کانفرنس

کراچی سے ایک صاحب رقمطراز ہیں:۔

بین الاقوامی اسلامی اقتصادی کانفرنس کے پہلے اجلاس کا فخر ہمارے شہر کراچی کو حاصل ہوا۔ اس کے ہر سالانہ اجلاس کے لئے ہر اسلامی نمائندہ سلطنت میں ایسا ہی اجتماع ہوا کرے گا جس میں سب زیرک جمع ہو کر اپنی فلاح و بہبود کے نئے نئے طریق کار سوچ کر اس پر عمل کرنے کے عہد کیا کریں گے۔ میرے خیال میں منشاء حج بعینہٖ یہی ہے۔ تو کیا یہ مناسب نہ تھا کہ یہ کانفرنس گذشتہ حج کے موقع پر طلب کی جاتی۔ اور منشاء ربانی پورا کر کے پاکستان غرض و غایت حج پوری کرنے کا سہرا اپنے سر لیتا اور آئندہ کیلئے بھی ایک نمونہ اور کارآمد مثال بن جاتی اور اس قدر زیادہ مسلمانوں کو ایک دوسرے کے حالات معلوم ہو جاتے کہ اس موجودہ کانفرنس سے اس کا عشر عشیر بھی نہ ہوئے ہوں گے۔ کیا کوئی طریقہ ایسا ہے جس سے حج (صحیح معنوں میں) سے لگاؤ پیدا کیا جا سکے؟۔

موجودہ کانفرنس اور نمائش بلاشبہ تعمیر کی طرف پہلا قدم ہے لیکن کانفرنس ہال کے ساتھ ملحقہ نمائش پر سرسری نظر ڈالنے سے اپنی زبوں حالی اور پس ماندگی کا ایک بین نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ نمائش کے چند بارونق سٹالوں پر سوائے امریکہ اور انگلستان کی اشیاء فروخت کی پبلسٹی کے اور کیا ہے جسے پاکستانی کہا جا سکے۔ لے دے کے حلوا پراٹھا اور کباب یہ چیزیں ایسی نظر آئیں جو پاکستانی "صنعت" کہلا سکتی ہیں۔ اور مقام شکر ہے کہ مسلمان گراں پائی کے باوجود ان کی ہمت افزائی سب سے زیادہ کر رہے ہیں۔ قنوطیت میرا شیوہ نہیں مگر بالآخر حقائق ہی تو ہیں ان کو جھٹلانا خود فریبی ہے۔

ایک اور چیز جو سب سے عجیب نظر آئی وہ اس نمائش میں مسجد کا وجود ہے۔ باوجود انتظار کے نمازی کوئی نظر نہ آیا۔ اب یہ تو گورنمنٹ کا فرض نہیں سمجھا جاتا کہ ہر پولیس کانسٹبل کو حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح کے معنی سمجھا کر ہر نمائشی (نمائش دیکھنے والے) پر مسلط کر دیا جائے اور نماز پڑھائے بغیر نمائش میں زیر حراست رکھے۔ میں نے ایک نمائشی سے کہا کہ بھائی آؤ نماز پڑھ لیں۔ وہ فی البدیہہ بولے

نمائش میں نماز؟ ہوں! اُدھر تو اس زور سے فلمی گانے بج رہے ہیں اور اِدھر نماز کون سُنے اور پڑھ سکے گا۔ ایک جگہ تو اس خوف سے سینما ہی جلا کر رکھ دیا جاتا ہے کہ مبادا اس کی بند چار دیواری سے جو آواز نکل کر فضا میں مرتعش ہوگی ممکن ہے وہ چلتی ہوئی ٹرام اور بس کے شور سے زیادہ ہو اور نمازیوں کا ایمان اور وضو اور نماز خراب ہو جائے۔ اور ایک طرف مسجد بنا کر اس زور شور سے گانے جاری ہیں کہ نمائش کے علاوہ ٹرام ڈپو ٹنگ کے مستری ورکشاپ میں بیٹھے جھوم رہے ہیں۔ میں نے ان کا بیان یہ کہہ کر پورا کر دیا کہ اور گانے بھی ان ہندوؤں کے جو ہندوستانی میں اور ہندی میں گاتے ہیں۔

یہ گانے تو ایک جملہ معترضہ سا بن گیا۔ مطلب دراصل یہ ہے کہ کام کی اہمیت اور تاریخ کی احادیث کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ انسب ترین معلوم ہوتا ہے کہ اپنے قدیمی مستقل مرکز میں زندگی کے آثار پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ہم خرما و ہم ثواب کے بھی جلوے نظر آئیں۔

طلوعِ اسلام | طلوعِ اسلام شروع ہی سے یہ کہتا چلا آرہا ہے کہ مسلمان جب تک حج کے اجتماع کو صحیح قرآنی خطوط پر متشکل نہ کریں گے ان کی اجتماعی زندگی کا کوئی گوشہ بھی ان برکات سے معمور نہیں ہوگا جو خدا کے قانون نے اس اجتماعِ ملی میں مضمر رکھی ہیں۔ قرآن کی رو سے ملت کے تمام اجتماعی منافع کا سرچشمہ عرفات کا میدان ہے۔ لیکن موجودہ رسمی حج سے یہ منافع کس طرح حاصل ہو سکتے ہیں؟

۳۔ آیۂ رجم | ایک صاحب لکھتے ہیں۔

نومبر کے طلوعِ اسلام میں آپ نے صحیح بخاری کی ایک روایت نقل کی ہے جس میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ کے زمانہ میں قرآن میں ایک آیت موجود تھی جس میں زانی کو سنگسار کرنے کا حکم تھا۔ اور اس کے بعد وہ آیت قرآن میں نہیں رہی۔ اسے پڑھ کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ یہ بات تو بہت دور تک پہنچ رہی ہے۔ کیا اس موضوع پر ہماری تفسیر کی کتابوں میں کوئی بحث ہوئی ہے؟ اسے ذرا تفصیل سے لکھئے۔ مجھے تو اس دن سے نیند نہیں آتی!

طلوعِ اسلام | اس روایت کو پڑھ کر آپ کی نیند کا اچاٹ ہو جانا بالکل فطری امر ہے۔ ہر سعید روح پر یہی کیفیت گذرے گی۔ ابھی تو آپ نے صرف ایک روایت دیکھی ہے۔ اگر آپ کہیں روایات کی ان تمام کتابوں کو دیکھ لیں تو معلوم آپ پر کیا گذرے گی۔ اس موضوع پر ہماری کتبِ تفسیر میں لمبی چوڑی بحثیں موجود ہیں اور انہوں نے بڑے شد و مد سے ثابت کیا ہے کہ واقعی قرآن میں اس قسم کی آیت موجود تھی اور وہ اب قرآن میں نہیں ہے۔ مثلاً تفسیر ابن کثیر میں (جس کا شمار بلند پایہ تفاسیر میں کیا جاتا ہے) سورۂ نور کی آیت متعلقہ زنا کے ضمن میں حسب ذیل تصریحات موجود ہیں:-

> موطا مالک میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ لوگو! اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا اور آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی۔ اس کتاب اللہ میں رجم کرنے کے حکم کی آیت بھی تھی جسے

ہم نے تلاوت کی، یاد کی، اس پر عمل بھی کیا خود حضورؐ کے زمانے میں بھی رجم ہوا اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ کچھ زمانہ گذرنے کے بعد کوئی یہ نہ کہنے لگے کہ ہم رجم کو کتاب اللہ میں نہیں پاتے، ایسا نہ ہو کہ وہ خدا کے اس فریضے کو جسے اللہ نے اپنی کتاب میں اتارا چھوڑ کر گمراہ ہو جائیں۔ کتاب اللہ میں رجم کا حکم مطلق حق ہے اس پر جو زنا کرے اور ہو شادی شدہ، خواہ مرد ہو یا عورت۔ جبکہ اس کے زنا پر شرعی دلیل ہو یا حمل ہو یا اقرار ہو۔ یہ حدیث صحیحین میں اسی بھی مطول ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ آپ نے اپنے خطبے میں فرمایا لوگ کہتے ہیں کہ رجم یعنی سنگساری کا مسئلہ ہم قرآن میں نہیں پاتے۔ قرآن میں صرف کوڑے مارنے کا حکم ہے۔ یاد رکھو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا۔ اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ کہیں گے قرآن میں جو نہ تھا عمرؓ نے لکھ دیا تو میں آیت رجم کو اسی طرح لکھ دیتا جس طرح نازل ہوئی تھی۔ یہ حدیث نسائی شریف میں بھی ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ آپ نے اپنے خطبے میں رجم کا ذکر کیا اور فرمایا رجم ضروری ہے وہ اللہ تعالیٰ کی حدوں میں سے ایک ہے۔ خود حضورؐ نے رجم کیا اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا۔ اگر لوگوں کے اس کہنے کا کھٹکا نہ ہوتا کہ عمرؓ نے کتاب اللہ میں زیادتی کی جو اس میں نہ تھی تو میں کتاب اللہ کے ایک طرف آیت رجم لکھ دیتا۔ عمر بن خطاب عبداللہ بن عوف اور فلاں اور فلاں کی شہادت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا اور ہم نے بھی رجم کیا۔ یاد رکھو تمہارے بعد ایسے لوگ آنے والے ہیں جو رجم کو اور شفاعت کو اور عذاب قبر کو جھٹلائیں گے اور اس بات کو بھی کہ کچھ لوگ جہنم سے اس کے بعد نکالے جائیں گے کہ وہ کوئلے ہو گئے ہوں۔ مسند احمد میں ہے کہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا رجم کے حکم کے انکار کرنے کی ہلاکت سے بچنا۔ امام ترمذیؒ بھی اسے لائے ہیں اور اسے صحیح کہا ہے۔ ابو یعلیٰ موصلی میں ہے کہ لوگ مروان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے حضرت زید بن ثابت بھی تھے، آپ نے فرمایا ہم قرآن میں پڑھتے تھے کہ شادی شدہ مرد یا عورت جب زنا کاری کریں تو انہیں ضرور رجم کر دو۔ مروان نے کہا پھر تم نے اس آیت کو قرآن میں نہ لکھ لیا؟ فرمایا سنو ہم میں جب اس کا ذکر چلا تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میں تمہاری تشفی کر دیتا ہوں ایک شخص نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اس نے آپ سے ایسا ذکر کیا اور رجم کا بیان کیا، کسی نے کہا یا رسول اللہ آپ رجم کی آیت لکھ لیجئے۔ آپ نے فرمایا اب تو میں اسے لکھ نہیں سکتا۔ یا اسی کے مثل۔ یہ روایت نسائی میں بھی ہے پس ان سب احادیث سے ثابت ہوا کہ رجم کی آیت پہلے لکھی ہوئی تھی پھر تلاوت میں منسوخ ہو گئی اور حکم باقی رہا۔ واللہ اعلم۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی بیوی کے رجم کا حکم دیا جس نے اپنے ملازم سے بدکاری کرائی تھی۔ اسی طرح حضورؐ نے ماعز رضی اللہ عنہ کو اور ایک غامدیہ عورت کو رجم کرایا۔ ان سب واقعات میں یہ مذکور نہیں کہ رجم سے پہلے آپ نے انہیں کوڑے بھی لگوائے ہوں، بلکہ ان

سب صحیح اور صاف حدیثوں میں صرف رجم کا ذکر ہے کسی میں بھی کوڑوں کا بیان نہیں۔ اسی لئے جمہور علماء اسلام کا یہی مذہب ہے۔ ابوحنیفہ، مالک، شافعی رحمہم اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں پہلے اسے کوڑے مارنے چاہئیں پھر رجم کرنا چاہیے تاکہ قرآن و حدیث دونوں پر عمل ہو جائے جیسے کہ حضرت امیرالمومنین علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جب آپ کے پاس سزا صلائی گئی جو شادی شدہ عورت تھی اور زناکاری میں آئی تھی تو آپ نے جمعرات کے دن کوڑے لگوائے اور جمعہ کے دن سنگسار کرا دیا۔ اور فرمایا کہ کتاب اللہ پر عمل کر کے میں نے کوڑے پڑوائے اور سنت رسول اللہ پر عمل کر کے سنگسار کرایا۔ مسند احمد، سنن اربعہ اور مسلم شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری بات لے لو میری بات لے لو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے راستہ نکال دیا، کنوارا کنواری کے ساتھ زنا کرلے تو سو کوڑے اور سال بھر کی جلا وطنی اور شادی شدہ شادی شدہ کے ساتھ کرے تو رجم۔

ملاحظہ فرمالیا آپ نے اسلاف کا تفسیری بیان؟ آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ وہ آیت جس میں زنا کی سزا سنگساری تھی کہاں چلی گئی اور جب آیت ہی نہیں رہی تو اس کا حکم کیسے باقی رہ گیا! لیکن اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ آپ کے ہاں یہ عقیدہ چلا آرہا ہے کہ قرآن میں بیشتر آیات ایسی ہیں جن کی تلاوت تو کی جاتی ہے لیکن ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے! یہ حکم، بعض دوسری آیات سے منسوخ سمجھا جاتا ہے اور بعض اوقات احادیث بھی قرآن کا حکم منسوخ کر دیتی ہیں۔ اور یہ عقیدہ بھی ہے کہ بعض آیات ایسی ہیں کہ جو قرآن میں موجود نہیں ہیں لیکن ان کا حکم باقی ہے۔ یعنی ان کی تلاوت منسوخ ہو گئی ہے اور حکم باقی ہے!

آپ شاید ہنسیں گے کہ ہم یہ کس قسم کی باتیں لکھ رہے ہیں! لیکن ہنسئے نہیں بلکہ روئیے اس قوم کی حالت پر جس میں ہزار برس سے یہ عقائد مسلسل چلے آرہے ہوں اور جو شخص ان کے خلاف آواز اٹھائے اسے خارج از اسلام ٹھہرا دیا جائے۔ باقی رہا یہ کہ "بات کہاں تک پہنچ جاتی ہے" سو مولوی کو اس سے کیا غرض کہ بات کہاں تک پہنچ جاتی ہے۔ اس نے اشخاص کو اپنا معبود بنا رکھا ہے اسے صرف اس سے غرض ہے کہ اس کے معبود محفوظ رہیں خواہ ان کی حفاظت میں خدا۔ رسول۔ قرآن۔ دین۔ علم۔ عقل۔ سب کے سب سیلاب کی نذر ہو جائیں۔ اور ان معبودوں کی حفاظت بھی وہ ان کے لئے نہیں کرتا، بلکہ اس لئے کرتا ہے کہ ان کی حفاظت میں خود اس کی حفاظت ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر مندر میں بت باقی نہ رہے تو برہمن کو کوئی نہ پوچھے گا۔

کس قدر تلخ ہیں یہ حقیقتیں لیکن انہیں بالآخر کب تک چھپایا جا سکے گا؟

تدریجی نبی

(جماعت اسلامی کا تجزیہ)

گزشتہ اشاعت میں، جماعت اسلامی کے متعلق جو تصریحات شائع کی گئی تھیں، ہمیں خوشی ہوئی کہ بہت سی سعید روحوں نے اس سے استفادہ کیا اور حقیقت حال منکشف ہوتے ہی انھوں نے اپنے مستقبل کے متعلق بھی سوچا کہ راہِ صواب کونسی ہے۔ ہم نے کہا تھا کہ جماعت اسلامی کے ارباب حل و عقد کے پیش نظر شروع ہی سے اپنی قیادت کا حصول و قیام تھا اور اس کے لئے ان کا پروگرام یکسر تخریبی تھا یعنی قائد اعظم کی قیادت کی مخالفت اور ان کے پیش کردہ مسلک، یعنی تحریک پاکستان کی مخالفت۔ لیکن اس مقصد تک پہنچنے کے لئے انھوں نے وہی تکنیک اختیار کی جو اس سے پیشتر قادیانی نبوت اختیار کرچکی تھی۔ یعنی مسلمانوں کے درد مند ریفارمر، مجدد، مہدی، مثیل مسیح کے بعد مقام نبوت پر فائز ہونے کا تدریجی اسلوب کار۔ اور اس دوران میں قرآن اٹھا اٹھا کر یہ اعلانات کہ جو یہ کہتا ہے کہ ہم آگے چل کر دعوئے نبوت کریں گے وہ ہم پر سخت اتہام لگاتا ہے، بہتان تراشتا ہے۔ ہم تو مدعی نبوت کو کافر سمجھتے ہیں۔ جماعت اسلامی کے دل میں جب ہوس اقتدار نے کروٹ لی تو اس وقت مسلمان اپنی جداگانہ قومیت کے دعوے کو ہندو اور انگریز سے منوانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان حضرات نے نہایت مشفقانہ اور مصلحانہ انداز میں مسلمانوں کے اس دعوے کی تائید شروع کی اور نیشنلسٹ مسلمانوں کے خلاف اس جدوجہد میں شریک ہوگئے اور اس طرح اپنی مقبولیت بڑھانی شروع کردی۔ چنانچہ یہ خود لکھتے ہیں۔

> جماعت کے اوائل دور میں جب وطنی قومیت کی تحریک مسلمانوں کو نگل لینے کے لئے سرگرم عمل تھی اور خود مسلمانوں کے بہت سے لیڈر اور کارکن اپنی خدمات اس تحریک کے لئے وقف کئے ہوئے تھے تو اس نازک لمحے میں جماعت اسلامی نے ملت کے سینہ میں اس فریضۂ اقامت دین کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی جو طبعی طور پر ملت سے اپنے جداگانہ وجود کو برقرار رکھنے کا تقاضا کرتا ہے۔
>
> (ترجمان القرآن بابت ستمبر سنہ ۱۹۴۹ء)

واضح رہے کہ ستمبر ۱۹۳۹ء کے ترجمان القرآن میں، جس سے مندرجہ بالا اقتباس لیا گیا ہے، جماعتِ اسلامی نے اپنی ان خدماتِ جلیلہ کو گنایا ہے جن کے پیشِ نظر وہ قوم سے آئندہ انتخابات میں ووٹ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مندرجہ صدر اقتباس سے ایک ناواقف کو یقیناً یہ خیال پیدا ہوگا کہ جماعتِ اسلامی کے اوائل دور میں مسلمان عام طور پر قومیت پرستی کی تحریک میں بہے جا رہے تھے اور یہ جماعتِ اسلامی تھی جس نے ان میں اپنے جداگانہ قومی تشخص کا احساس پیدا کیا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کا احساس، علامہ اقبالؒ ۱۹۰۷ء سے پیدا کرتے چلے آ رہے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں انہوں نے الٰہ آباد کے مقام پر اسی جداگانہ قومیت کی بنیاد پر جداگانہ مملکت کا تصور بیدار کیا جسے ۱۹۳۸ء میں قائدِ اعظم مرحوم نے ایک مثبت سیاسی دعوے کی حیثیت سے پیش کیا۔ جماعتِ اسلامی کا نام ہی پہلی بار ۱۹۴۱ء یا ۱۹۴۲ء میں سنا گیا۔ بایں ہمہ، اس جماعت کا اب دعوےٰ یہ ہے کہ اسی نے ملت کے سینہ میں اس فریضۂ اقامتِ دین کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی (احساس پیدا کرنے کے الفاظ پر غور کیجئے۔ گویا اس سے پہلے ملت کے دل میں اس کا احساس تک پیدا نہیں ہوا تھا۔ یہ احساس جماعتِ اسلامی کا پیدا کردہ ہے!) پھر اسے بھی سامنے رکھئے کہ اس وقت بھی مسلمانوں کی قیادت وہی تھی جسے آگے چل کر اسلامی جماعت نے "غیر صالح قیادت" قرار دے کر بدترین مخالفت شروع کر دی تھی۔ لیکن اس وقت چونکہ مسلمانوں میں مقبول بننا مقصود تھا اس لئے اس وقت اس سوال کو بالکل نہیں چھیڑا گیا۔ "تدریجی نبوت" کی ٹیکنک کا ایسا ہی تقاضا ہوتا ہے۔

اب آگے چلئے ارشاد ہے:

> پھر جب وطنی تحریک کے گرداب سے ملت کا سفینہ نکل آیا اور مسلمان جداگانہ طور پر تحریکِ پاکستان کے لئے منظم ہو کر سرگرمِ عمل ہونے لگے تو جماعتِ اسلامی نے ان کو مسلسل یہ دعوت دی کہ وہ اپنی تحریک کو خالص اسلامی طرز پہ نشو ونما دیں۔

یعنی جب جماعتِ اسلامی کی کوششوں سے ملت کا سفینہ وطنی تحریک کے گرداب سے نکل آیا! کتنا بڑا احسان ہے ملت کی گردن پر اس مقدس جماعت کا جس نے ملت کو ایسے گرداب سے نجات دلائی۔ اور کیسی محسن کش ہے یہ ملت کہ اس نے اس کے باوجود انہیں چھوڑ کر مسٹر جناح کو اپنا قائد بنا لیا۔

اس کے بعد ارشاد ہے:

> جب تو اکھلی، شمالی پنجاب اور صوبہ بہار میں فسادات کا طوفان اٹھا تو جماعتِ اسلامی احترامِ انسانیت، قیامِ امن، اعانتِ مظلوم، مداخلتِ ظلم اور بحالیٔ اخلاق کے پیغام لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے کارکنوں نے جہاں ایک طرف بے اطمینان مسلمانوں کو منظم کرنے، ان کے حوصلے (Morale) کو بحال کرنے اور ان کو مختلف طریقوں سے امداد بہم پہنچانے کی

کوشش کی وہاں دوسری طرف مسلمانوں کو بھی اور غیر مسلمانوں کو بھی باہمی قتل و مقاتلہ اور بوڑھوں اور بچوں پر درازدستی اور عورتوں پر زیادتی کرنے سے باز رکھنے کے لئے ان کے شریفانہ جذبات سے اپیل کی۔

یہ حصہ تلبیس حق و باطل اور کتمانِ حقیقت کی بڑی پرفریب مثال پیش کرتا ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب اس جماعت نے مسلمانوں کی قیادت اور ان کے دعوئے پاکستان کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگانا شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے شروع میں جس جداگانہ قومیت" کی تائید کی تھی اب اسی جداگانہ قومیت کے خلاف یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ مسلمان، محض مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہو کر ایک الگ قوم کے دعویدار بن رہے ہیں۔ یہ جب تک پورے کے پورے مسلمان نہ بن جائیں ان کی جداگانہ قومیت کا دعویٰ ایک سیاسی ہتھکنڈا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور ان کے مخالفین کی طرف سے نیشنلزم کی تحریک کی کشمکش انتہائی نازک مقام پر پہنچ چکی تھی اور فیصلے کی گھڑیاں قریب سے قریب تر آتی جا رہی تھیں، اس جماعت نے عین اسوقت اس فتنہ کا آغاز کیا تھا اور کھلے بندوں پاکستان کے مطالبہ کی مخالفت شروع کر دی تھی۔ اس وقت "مصلحینِ ملت کے اس مقدس طائفہ" کا ایک ایک کارکن، جناح کو گالیاں دینے اور پاکستان کو غیر اسلامی ثابت کرنے میں مصروفِ عمل تھا۔ اگر کسی جگہ مسلمان قتل ہوتے تھے تو اس جماعت کا ردِ عمل یہ ہوتا تھا کہ ان پیدائشی مسلمانوں اور غیر مسلموں میں فرق کیا ہے۔ یہ مسلمان باقی رہیں یا نہ رہیں اس سے اسلام پر کیا اثر پڑتا ہے! ان کے اس وقت کے لٹریچر کو اٹھا کر دیکھئے۔ یہ لوگ کس طرح مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنے کے "جہادِ عظیم" میں مصروفِ تگ و تاز تھے۔ آج یہ لوگ ملت پر اپنے احسان جتاتے ہیں! اس میں شبہ نہیں کہ عوام کا حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے اور انھیں تقدس کے جاذب نگاہ نقاب میں جلد فریب دیا جا سکتا ہے، لیکن واقعات کو کہاں تک چھپایا جا سکتا ہے ہم اس جماعت کو دعوت دیتے ہیں کہ اگر ان میں اخلاقی جرأت کی کوئی رمق موجود ہے تو یہ اپنے اس زمانہ کے لٹریچر کو، جب یہ مسٹر جناح کی قیادت اور مسلمانوں کے مطالبہ حصولِ پاکستان کی اس طرح مخالفت کیا کرتے تھے، ذرا منظرِ عام پر لائیں اور اس کے بعد قوم سے اپنے ان اہانات کا بدلہ مانگیں! ان سے اس زمانہ میں کہا جاتا تھا کہ بابا! خدا کے لئے ان تیروں کو کچھ وقت کے لئے اپنے ترکش میں رہنے دو۔ ان سے ملت کا سینہ فگار مت کرو۔ مسلمانوں پر بڑا نازک وقت آ پڑا ہے۔ ہندو اور انگریز کی متحدہ قوتیں انھیں ہندوستان سے ختم کر دینے پر تلی ہوئی ہیں۔ یہاں کے مسلمانوں کی قسمت کے فیصلے آئینی بساط پر ہو رہے ہیں۔ انھیں ایک خطۂ زمین حاصل کر لینے دو۔ اس کے بعد آپ انھیں مسلمان بنا لینا۔ لیکن یہ ہر ایک کا مضحکہ اڑاتے اور ایسا کہنے والوں کو اسلام کا بدترین دشمن بتاتے تھے۔ آج یہ لوگ ووٹ حاصل کرنے کے لئے فرماتے ہیں کہ

> ہمارے نزدیک پاکستان کے دفاع کی حیثیت وہی ہے جو اس قطعۂ زمین کی حفاظت کی ہوتی ہے جو مسجد بنانے کے لئے حاصل کیا گیا ہو۔

بعینہٖ یہی بات ان سے اس وقت کہی جاتی تھی اور یہ اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے اعصاب پر جناحؒ کی قیادت کا جن اس بری طرح سے سوار تھا کہ یہ بھی مشرقی کی طرح، جوشِ انتقام میں اندھے ہو رہے تھے اور ان کی قیادت کی شکست و ریخت میں اگر ساری کی ساری قوم تباہ ہوتی تھی تو بھی انہیں اس میں ذرا سا بھی تامل نہ تھا۔ انہیں مسلمانوں کے خلاف غصہ ہی اس بات پر تھا کہ انہوں نے انہیں چھوڑ کر، جناحؒ کو قائد کیوں بنا لیا ہے۔ اس جرم کی پاداش میں، یہ لوگ مسلمانوں کو انتہائی سزا دینے پہ تُلے ہوئے تھے۔ وہ تو یوں کہئے کہ یہ کچھ اللہ ہی کو منظور تھا کہ اس نے یہاں کے پانچ چھ کروڑ مسلمانوں کو محفوظ رکھ لیا۔ ورنہ اس مقدس جماعت اور علامہ مشرقی[1] کے جنون نے مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔

پھر لکھتے ہیں،

> اسی طرح جب صوبہ سرحد کے باشندوں سے پاکستان اور انڈین یونین میں سے کسی ایک کے ساتھ وابستہ ہونے کے بارے میں استصواب کیا گیا تو جماعتِ اسلامی کے کارکنوں نے اپنی آراء پاکستان کے حق میں دیں اور دوسروں کو بھی یہی رہنمائی دی۔

ہمیں اس دیدہ دلیری پر بڑی حیرت ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ اس زمانہ میں جماعتِ اسلامی نے فیصلہ یہ کیا تھا کہ تحریکِ پاکستان میں تعاون، تعاون علی الاثم والعدوان۔ (گناہ اور سرکشی کے کاموں میں معاونت) ہے اس لئے اس جماعت کے افراد کو اس قسم کے استصوابات میں کوئی حصہ نہیں لینا چاہئے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے استصوابِ سرحد کے سلسلہ میں دارالاسلام میں ان کا ایک اجتماع بھی ہوا تھا جس میں یہی فیصلہ کیا گیا تھا۔ آج ان کی جرأت ملاحظہ فرمائیے کہ وہ استصوابِ سرحد میں کامیابی کا سہرا بھی جماعتِ اسلامی ہی کی رہنمائی کے سر باندھ رہے ہیں۔ کیا جماعتِ اسلامی اپنی کسی قرارداد یا کارکنوں کے نام اپنی کسی ہدایت کو پیش کر سکتی ہے جو اس نے استصوابِ سرحد کے سلسلہ میں پاس کی ہو یا بطور رہنمائی شائع کی ہو؟ بات صاف ہو جائیگی۔

اس کے بعد ارشاد ہے؛

> پھر جب تقسیم ملک واقع ہو گئی اور خستہ حال مہاجرین پاکستان آنا شروع ہوئے تو جماعتِ اسلامی کے کارکنوں نے ..... (مختلف) کیمپوں میں مہاجرین کی مختلف خدمات انجام دیکر اس امر کا مظاہرہ کیا کہ اسلام مسلمانوں سے مہاجر مسلمانوں کے لئے کس قسم کی انصاریت کا مطالبہ کرتا ہے۔

---

[1] واضح رہے کہ ہم یہ کچھ علامہ مشرقی کے متعلق لکھ رہے ہیں۔ تحریکِ خاکساران کے متعلق نہیں۔ وہ تحریک تو ایسی تھی کہ اگر اسے علامہ مشرقی کے اس حسد کی آگ جو قائداعظمؒ کی قیادت اور مقبولیت سے ان کے سودائی مزاج میں بھڑکا دی تھی، پھونک کر نہ رکھ دیتی تو آج ہندوستان اور پاکستان کا نقشہ بالکل مختلف ہوتا۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

غور فرمائیے! یہ اس جماعت کا بیان ہے جس کے ارکان اس زمانہ میں جب مسلمانوں پر یہ قیامت ٹوٹ رہی تھی، ہر جگہ یہ کہتے پھرتے تھے کہ یہ سب کچھ اس قیادت کی وجہ سے ہوا ہے جس کے خلاف ہم اتنے عرصہ سے مسلمانوں کو متنبہ کرتے چلے آرہے تھے۔

اس کے بعد تحریر ہے کہ پھر جماعت اسلامی نے "مطالبۂ نظام اسلامی" کے لئے اپنی منظم تحریک بپا کی کہ "دستور ساز اسمبلی نے ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو اس مطالبہ کو دستوری حیثیت سے تسلیم کرکے وہ قرار دادِ مقاصد پاس کر دی کہ جس کے ہوتے ہوئے کسی غیر اسلامی دستور و نظام کو جاری کرنے کے دستوری راستے بہرحال بند ہیں"۔

یعنی قراردادِ مقاصد بھی اسلامی جماعت ہی کی منظم تحریک کا نتیجہ تھی! ان کے نزدیک زمین و آسمان میں آج جو حرکت بھی ہو رہی ہے سب اسلامی جماعت کی "منظم تحریک" کے صدقے ہو رہی ہے۔ معلوم نہیں یہ خود فریبی ہے یا ابلہ فریبی!

اب وہ منزل سامنے آرہی ہے جس کے لئے یہ سب پاپڑ بیلے گئے تھے۔ یعنی حصولِ قیادت کا موقعہ! چنانچہ ارشاد ہے:

> پھر اس قرارداد مقاصد کے پاس ہونے کے بعد جب جماعتِ اسلامی نے یہ محسوس کیا کہ اس قرارداد کے تقاضوں کے مطابق ملت جن تبدیلیوں کے ظہور کی آرزومند ہے ان کے واقع ہونے میں بدقسمتی سے ارباب اقتدار کا وہ گروہ حائل ہے جو اپنے ذہن و سیرت کی مخصوص ساخت کی وجہ سے یہ اہلیت نہیں رکھتا کہ اسلامی نظام کی امامت کا فرض ادا کر سکے تو جماعت نے پورے دلائل کے ساتھ انقلاب قیادت کی دعوت کو عوام تک پہنچانے کا آغاز کر دیا۔ اب اس انقلابِ قیادت کو اسلام کے منشا کے مطابق برپا کرنے کے لئے رائے عامہ کو اسلامی اصولوں کی تربیت دینے کا جو مرحلہ سامنے آگیا ہے اس میں جماعتِ اسلامی قول و عمل سے شہادتِ حق کا فریضہ انجام دینے اٹھی ہے۔

اور اس "انقلابِ قیادت" کو اسلام کے منشار کے مطابق برپا کرنے کے لئے کیا کیا جائیگا؟ الیکشن لڑا جائے گا!

> اب جبکہ ہم نے اپنے حقیر سے سرمایۂ ایمان و اخلاق کو انتخابات میں اسی طرح استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے جس طرح پہلے فسادات میں، پھر سرحد کے ریفرنڈم میں، پھر مہاجرین کی بحالی کے کام میں اور پھر تحریک مطالبہ میں اسے استعمال کیا تھا تو ہمیں وہ سارے اہتمام کرنے چاہئیں جو اسے نہ صرف لٹنے سے بچائیں بلکہ اس پر ملک و ملت کو بھی اور خود ہم کو بھی مزید منافع دلائیں۔ (ترجمان القرآن بابت اکتوبر ۱۹۴۹ء)

لیجئے صاحب! اب اس "سرمایۂ ایمان و اخلاق" کو ٹھکانے لگانے کا وقت آگیا ہے جس کے لئے اتنے عرصہ سے دوسروں کی قیادت میں کیڑے ڈالے جا رہے تھے!

جماعتِ اسلامی نے اپنی خدمات اسلامی کی جو مدیح تفصیل اوپر گنائی ہے اس میں ایک کڑی باقی رہ گئی ہے جس کا ذکر ناگزیر ہے یعنی جب انھوں نے اپنی بیش بہا قربانیوں سے پاکستان دلا دیا۔ سرحد کے ریفرنڈم میں اپنی بصیرت افروز رہنمائی سے کامیابی بھی

دلادی۔ اور اپنی جانفروشیوں سے مہاجرین کی بحالی کا مسئلہ بھی حل کرادیا۔ اور اس کے بعد انھوں نے دیکھا کہ ہندو کے عزائم مشئومہ اب کشمیر کے راستے پاکستان کے لئے مستقل خطرہ بن کر سامنے آرہے ہیں۔ تو ان کی جمعیتِ اسلامی پھر جوش میں آئی اور انھوں نے فتویٰ صادر فرمادیا کہ کشمیر کی جنگ کوئی اسلامی جنگ نہیں اس لئے اس میں سپاہیوں کی حیثیت سے شرکت جائز نہیں قرار دی جاسکتی!! اور یہ فتویٰ یہ جانتے ہوئے صادر فرمایا کہ اس سے جنگِ کشمیر کو کس قدر نقصان پہنچے گا۔ چنانچہ اس باب میں خود ترجمان القرآن رقمطراز ہے کہ

> پشاور میں جب سائل نے ان سے (امیر جماعتِ اسلامی سے) کہا کہ میں تو اس بات (یعنی ان کے فتویٰ) کو شائع کراؤں گا تو مولانا نے ان کو اس حرکت سے باز رہنے کیلئے یہ کہا کہ اس حرکت سے تم جتنا نقصان مجھے پہنچانا چاہتے ہو اس سے زیادہ نقصان تم جہادِ کشمیر کو پہنچاؤ گے۔

ذرا غور فرمایئے حضرت امیر جماعتِ اسلامی کی اس "مآل اندیشی" کو۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ ان کا یہ فتویٰ جہادِ کشمیر کو کس قدر نقصان پہنچائیگا (یعنی بالفاظِ دیگر ہندوؤں کو کتنا فائدہ پہنچائیگا)۔ لیکن اس کے باوجود سائل کو یہ فتوے دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ تاکید کردیتے ہیں کہ دیکھنا بھائی! میں نے یہ بات صرف تم ہی سے کہی ہے۔ اسے کسی دوسرے سے نہ کہنا۔ اور اس کے بعد مطمئن ہوجاتے ہیں کہ میں نے اپنا فریضۂ دین بھی ادا کردیا اور ملت کو اس کے مہلک اثرات سے بھی بچالیا! قربانت شوم۔ کیا سادگی ہے۔ اللہ والوں کی باتیں ایسی ہی ہوا کرتی ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں اربابِ جماعتِ اسلامی سے کہ اگر یہ فتویٰ ایسا تھا کہ اس کی اشاعت سے جہادِ کشمیر کو اس قدر نقصان پہنچنے کا احتمال تھا تو وہ کونسی مجبوری تھی جس کے ماتحت ان کے امیر نے سائل کو اس زہر کا سراغ دیدیا؟ اور اگر مجبوری یہ تھی کہ حق بات کو چھپانا گناہ ہے تو پھر جنابِ امیر نے اس سائل کو اس کی تاکید کیوں کردی کہ وہ اس حق بات کو آگے نہ پھیلائے! اگر یہ بات حق تھی تو اس کا چھپانا سائل کے لئے بھی ایسا ہی گناہ تھا جیسا مودودی صاحب کے لئے۔ اور اگر جہادِ کشمیر کو نقصان سے بچانا زیادہ ضروری تھا تو امیر صاحب نے خود اس پر عمل کیوں نہ کیا؟ "آگ لگا کر جمالو دور کھڑی" کی کہاوت تو عامیانہ ہے لیکن ہے کسقدر برجستہ۔ سائل سے ایسی خطرناک بات کہہ بھی دیتے ہیں اور اس کے بعد نہایت معصومیت سے فرماتے ہیں کہ میں نے تو اس سے ساتھ ہی کہدیا تھا کہ اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ لہٰذا جہادِ کشمیر کو نقصان پہنچانے کا ذمہ دار سائل ہے۔ میں تھوڑا ہوں؟

یہ ہے وہ خدمتِ جلیلہ جس کا ذکر ترجمان القرآن نے اپنی فہرستِ خدمات میں نہیں کیا۔ یعنی ایک اس بات کا کہ جماعتِ اسلامی نے پاکستان بننے سے پہلے، پاکستان کے خلاف کس قدر زہر اگلا اور دوسرے یہ کہ جب ان کی مخالفتوں کے علی الرغم پاکستان بن گیا تو انھوں نے مسئلہ کشمیر کے راستے اس کیلئے خطرات پیدا کرنے کیلئے کیا کچھ کیا؟

یہ ہے وہ جماعت جو اپنے "سرمایۂ ایمان واخلاق" کو لے کر الیکشن لڑنے کے لئے میدان میں آرہی ہے! ہم حیران ہیں کہ مسلمان کس قدر سادہ لوح واقعہ ہوا ہے جو ایسے کھلے ہوئے حقائق کو بھی آنکھوں سے اوجھل کردیتا ہے۔ لیکن اس میں مسلمان بچارا کیا کرے؟ جو

فتنۂ تقدیس کی راہوں سے کھڑا کیا جاتا ہے اس کی رَو میں بڑے بڑے بہ جاتے ہیں۔ یہ وہ جماعت ہے جو غیر صالح قیادت کے خلاف بڑے شور و مد سے یہ الزام دہرتی رہی کہ یہ لوگ ان مناصب کے لئے امیدوار بن کر آگے آئے ہیں حالانکہ اسلام میں کسی ایسے شخص کو منصب نہیں دیا جا سکتا جو اس کے لئے امیدوار ہو۔ اور اس کی سند میں رسول اللہ کی یہ حدیث بڑے زور شور سے پیش کرتی رہی کہ

قال رسول اللّٰہ انا واللّٰہ لا نولی علی ھذا العمل احداً اسئلہ او احداً حرص علیہ۔ (صحیح مسلم) — حضور نے فرمایا کہ ہم بخدا یہ منصب حکومت کسی ایسے شخص کے حوالے نہیں کر سکتے جو اس کیلئے درخواست کرے یا اس کا طالب ہو۔

اب یہی جماعت، الیکشن میں اپنے امیدوار کھڑے کرے گی اور اس کا یہ عمل نہ اسلام کے اصولِ انتخاب کے خلاف جائے گا، نہ رسول اللہ کے ارشادِ گرامی کے خلاف۔ یہ ہے "صالحین کی وہ جماعت" جو انقلابِ قیادت برپا کرنے کے لئے نیزوں پر قرآن لٹکا کر میدان میں آرہی ہے۔

طلوعِ اسلام کی نہ کوئی اپنی پارٹی ہے نہ اس کا کوئی امیدوار۔ اس لئے ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ الیکشن جیتنے کے لئے نہیں کہہ رہے۔ ہم مسلمانوں سے اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ اگر وہ تقویٰ اور تقدس کے نعروں سے متاثر ہو کر ان لوگوں کی تائید کرنے لگ گئے تو دو باتوں میں سے ایک بات ضرور ہو کر رہے گی۔ اگر حکومت ان لوگوں کے ہاتھ میں آگئی تو پاکستان پر پیشوائیت (Theocracy) کی وہ لعنت مسلط ہو جائے گی جسے اسلام مٹانے کے لئے آیا تھا۔ اور اگر ان لوگوں نے دیکھا کہ زمامِ اقتدار ان کے ہاتھ سے نکلے جا رہی ہے تو یہ پورے پاکستان کو تباہ کر دینے میں ذرا بھی دریغ نہیں کریں گے۔ اس لئے کہ ان کے پیشِ نظر محض اپنا ذاتی اقتدار ہے اور بس۔ نہ یہ پاکستان کے حامی ہیں نہ مسلمانوں کے ہمدرد۔ پاکستان کی حمایت اس لئے ہو رہی ہے کہ اس میں انھیں اپنے اقتدار قائم کرنے کے مواقع نظر آتے ہیں۔ اگر انھیں یقین ہو گیا کہ اس میں ان کا اقتدار قائم نہیں ہو سکتا تو جس طرح یہ لوگ جناح کی قیادت کی شکست و ریخت میں پورا زور لگا رہے تھے اسی طرح پاکستان کی تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ اللہ قوم کو ان مقدس فتنوں سے محفوظ رکھے۔

کیا آپ نے اپنا چندہ ارسال فرما دیا ہے؟

اگر نہیں

تو جلدی کیجئے۔ آئندہ پرچہ صرف انہی حضرات کی خدمت میں روانہ کیا جائے گا
جن کا چندہ وصول ہو جائے گا۔

آہ مولانا شبیر احمد عثمانی

۱۳۶۹ھ

حادثہ ایسا ہے مولانائے عثمانی کی موت
دل کو جس پر صبر آسانی سے آسکتا نہیں

جس کی تقریروں سے ہل جاتے تھے دنیا بھر کے دل
سامنے حکمِ قضا کے لب ہلا سکتا نہیں

گم ہوا وہ بے بہا گوہر بہاولپور میں
جو کسی قیمت پہ بھی اب ہاتھ آسکتا نہیں

وہ خطیبِ زندہ دل، وہ عالمِ صاحب نظر
جس کا ثانی عالمِ اسلام پا سکتا نہیں

ایسا دل، ایسی نظر، ایسی زباں، ایسا دماغ
اتنا جوہر ایک پیکر میں سما سکتا نہیں

صدق پر ثابت قدم رہ کر یہ ثابت کر دیا
کوئی بھی اہلِ یقیں کو ورغلا سکتا نہیں

طبع کی نرمی میں پنہاں پختگی ایمان کی
جیسے دب کر بیج دانے کو دبا سکتا نہیں

خلوت و جلوت میں اک ملبوس، اک طرزِ بیاں
آج کوئی ایسی یکرنگی دکھا سکتا نہیں

سب پہ کر دیتا عیاں اس کی خطابت کا خلوص
دل کا وہ جذبہ جو لفظوں میں سما سکتا نہیں

آسماں نے جسمِ خاکی کو ملایا خاک میں
لیکن اُس کے نقشِ عظمت کو مٹا سکتا نہیں

رکھ گیا ایسی بنا آئینِ پاکستان کی
جس کی ہٹ کر اب کوئی دیوار اٹھا سکتا نہیں

نام عثمانی کو بھی مانندِ اقبال و جناح
ملکِ پاکستاں قیامت تک بھلا سکتا نہیں

اسد ملتانی

اسبابِ زوالِ امّت

پرویز

چہ گوئمت کہ چہ بودی، چہ کردۂ پشدی
کہ خوں کند جگرم را ایازیٔ محمودؐ
تو آں نہ کہ مصلےٰ ز کہکشاں می کرد
شراصوفی و شاعر تراز خویش ربود

طلوعِ اسلام نے اپنی اشاعت بابت مارچ سنہ ۱۹۴۹ء میں "ایک اہم سوال" کے عنوان سے ایک ایسی بحث کا آغاز کیا جس کی اہمیت میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ سوال مختصر الفاظ میں یہ تھا کہ دنیا میں مسلمان جہاں جہاں آباد ہیں، غیر مسلموں کے مقابلہ میں ان کی حالت پست و زبوں ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ بالآخر ایسا کیوں ہے؟ اس کے بعد طلوعِ اسلام نے یہ لکھا تھا کہ

> اب آپ سوچئے کہ اگر ایک غیر مسلم مبصر، حالات کے تجزیہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ اقوامِ عالم کے مقابل میں مسلمانوں کی پستی اور ذلت کا باعث ان کا مذہب ہے تو آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟

اس کے بعد طلوعِ اسلام نے تمام اربابِ فکر و نظر کو دعوت دی تھی کہ وہ وقت کے اس اہم سوال پر غور کریں اور اپنے نتائجِ فکر و تدبر سے طلوعِ اسلام کو مطلع فرمائیں تاکہ انہیں طلوعِ اسلام میں شائع کر کے کسی آخری نتیجہ پر پہنچا جا سکے۔ چنانچہ اس سوال کے جواب میں مختلف گوشوں سے جو کچھ طلوعِ اسلام میں شائع ہوتا رہا ہے بغائر اس کا مطالعہ کرتا رہا کہ سوال زیرِ غور وہ تھا جس نے خود مجھے ایک عرصہ سے طلسمِ پیچ و تاب بنا رکھا تھا اور میں چاہتا تھا کہ کسی صاحبِ فکر کی طرف سے اس کا کھلا کھلا جواب میرے سامنے آ سکے۔ طلوعِ اسلام میں اس ضمن میں جو کچھ اس وقت تک شائع ہوا ہے

اس کا بیشتر حصہ تو اسی انداز کا تھا کہ چونکہ مسلمانوں نے اپنا مذہب چھوڑ رکھا ہے اس لئے ان کی حالت اس قدر پست و ذلیل ہو گئی ہے۔ حالانکہ اس جواب کے متعلق طلوع اسلام نے شروع ہی میں لکھ دیا تھا کہ

> یہ جواب حقائق کو بے نقاب دیکھنے والوں کو مطمئن نہیں کر سکتا۔ وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر مسلمانوں نے مذہب کو چھوڑ دیا ہے تو غیر مسلم اقوام مغرب نے مذہب کو کب سے باندھ رکھا ہے۔ انہوں نے اس سے بھی پہلے اور ان سے کہیں شدید انداز سے مذہب کو چھوڑ رکھا ہے۔ اس لئے اس صورت میں دونوں یکساں ہو گئے۔ پھر وہ کونسی بات ہے جس کی وجہ سے غیر مسلم اقوام اس قدر طاقتور ہیں اور مسلم اقوام دنیا کے ہر گوشے میں کمزور اور ذلیل ہیں۔ پھر یہ بھی کہ بالآخر ایسے مسلمان بھی تو ہیں جنہوں نے مذہب کو نہیں چھوڑا ان کی حالت کونسی اچھی ہے؟

اس دوران میں اکثر حضرات نے براہ راست مجھ سے اور بعض نے طلوع اسلام کی وساطت سے پوچھا کہ میں اس باب میں کیوں خاموش ہوں؟ استفسارات نے تقاضے اور تقاضوں نے اصرار و تکرار کی صورت اختیار کی۔ میں ان تقاضوں کے جواب میں بھی خاموش تھا اور جب بعض احباب کا اصرار لب کشائی پر مجبور ہی کر دیتا تھا تو اتنا کہہ کر چپ ہو جاتا تھا کہ

داستان ادھمیرس از من کن — چوں بگوید آنچہ ناید در سخن
در گلویم گریہ ھا گرد و گرہ — ایں قیامت اندرون سینہ بہ

یہ نہیں کہ اس سوال کے جواب میں میرے پاس کچھ کہنے کو نہیں تھا جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے، یہ سوال ایک عرصہ سے خود میرے سامنے تھا۔ درحقیقت یہ ہے کہ اسی سوال پر کیا منحصر ہے۔ میری تو تمام عمر اس اجمال کی تفصیل ہے کہ

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی، کبھی پیچ و تاب رازی

لیکن اس سوال کے جواب میں جو دشواری میرے گلوگیر ہو رہی تھی وہ یہ خیال تھا کہ میری بصیرت قرآنی نے مجھے جس نتیجہ تک پہنچایا ہے مسلمان اسے سننے کے لئے ابھی تیار نہیں۔ حضرت علامہ نے کہا تھا کہ

نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

فرنگ ان کی نواؤں کی تاب لا سکا یا نہ، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہنوز مسلمان میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ ان نواؤں کی تاب لا سکے جو اس کی صحیح تصویر کو قرآن کے آئینہ میں بے نقاب دیکھ کر، ایک قلب حساس سے نغمہ لاہن کر اٹھتی ہیں اور فضا کے سینے کو چیر کر آسمان سے جا ٹکراتی ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے بڑی الم انگیز اور حدیث ہے بڑی جگر خراش کہ مسلمان اپنی اصلی تصویر دیکھنے کے لئے قطعاً تیار نہیں۔ وہ اس حبشی کی طرح جس نے آئینہ میں اپنی بھیانک شکل دیکھ کر آئینہ توڑ ڈالا تھا، ہر اس شخص کے پیچھے پڑ جاتا ہے جو اُسے

اس کے حقیقی خط و خال سے آگاہ کرتا ہے۔ بہت دنوں کی بات ہے۔ دلّی میں ایک بڈھے باپ کا اکلوتا جوان بیٹا فوت ہو گیا۔ زدِ غم نے باپ کو پاگل کر دیا۔ وہ رات کو اٹھا اور بیٹے کی لاش کو قبر سے نکال لایا۔ وہ لاش کو سینے سے لگائے پھر رہا تھا۔ جو شخص لاش کو چھڑانے کے لئے آگے بڑھتا وہ اُسے چاقو دکھاتا اور جو اس لاش کو مُردہ کہتا، وہ اسے پتھر مارتا۔ مسلمان نے بھی چند تصورات و رسوم کی لاشوں کو اپنے سینے سے لگا رکھا ہے۔ جو شخص ان لاشوں کو اس سے الگ کرنے کے لئے آگے بڑھتا ہے وہ اسے چاقو دکھاتا ہے اور جو انہیں مردہ کہتا ہے وہ اسے پتھر مارتا ہے۔ میں نے عمر بھر اس کی کوشش کی ہے کہ جس انداز سے قرآن کی روشنی نے حقیقت مجھ پر بے نقاب کی ہے کہ جس جسدِ بے جان کو مسلمان محبوبِ جاں نواز سمجھ کر سینے سے لگائے لگائے پھر رہا ہے وہ ایک لاش سے زیادہ کچھ نہیں، اسی انداز سے یہ حقیقت دوسروں کے سامنے بھی پیش کر دوں۔ اس لئے مجھے طلوعِ اسلام کے پیش کردہ سوال کے متعلق بھی اپنی قرآنی بصیرت کی روشنی میں کچھ عرض کرنے میں تامل نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ سوال ایسا تھا کہ جس بات تک میں مسلمانوں کو آہستہ آہستہ، بتدریج پہنچانا چاہتا تھا یہ ایک ہی جست میں انہیں اس منزل کے سامنے لا کھڑا کرنا چاہتا تھا اس لئے میں اس باب میں لب کشائی کے لئے متامل تھا اور حرزِ جاں اسی نتیجہ پر پہنچتا تھا کہ

اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

اس میں شبہ نہیں کہ جہاں ایک طرف، میرا یہ مسلک تدریج و امہال مزید ترابص انتظار اور ضبط و انضباط کا متقاضی تھا اور قدم قدم پر یہ کہہ کر عناں گیر ہو جاتا تھا کہ

غمِ دل نگفتہ بہتر ہمہ کس جگر ندارد

وہاں دوسری طرف کیفیت یہ تھی کہ جب میں عام طور پر ان جوابات کو دیکھتا تھا جو طلوعِ اسلام میں شائع ہو رہے تھے تو اس احساس سے کہ

عرب کہ بادہ دہد محفلِ شبانہ کجاست؟　　عجم کہ زندہ کند رودِ عاشقانہ کجاست؟
بزیرِ خرقۂ پیراں سبو چہ باخالیست　　فغاں کہ کس نشناسد مئے جوانہ کجاست؟

میری بیتابیٔ تمنا، تدریج و امہال کی مصلحت کوشیوں کو بالائے طاق رکھ دینے کے لئے کوندے کی طرح لپکتی تھی اور میں اس بات کے لئے تیار ہو جاتا تھا کہ جو بات آخر میں کہنی ہے اسے آج ہی کیوں نہ کہہ دوں کہ بالآخر

از سینہ تا بچند بر آرم شرر و برم
ایں نیم قطرہ خوں کہ ز مژگاں چکیدنی ست

میں اسی کشمکش میں تھا کہ بعض قریب ترین احباب (اور ادارہ طلوعِ اسلام) کا تقاضا اس نقطہ تک آ پہنچا کہ جہاں —

بیاکہ من ز سپہر اندا ختم۔ کے سوا کچھ اور چارہ نہیں رہا کرتا ہے اس محفلِ شوق میں میرے سب سے آخر میں پہنچنے کی داستان جز اختیار یعنی ؎

ای آہِ جگر سوزے در خلوتِ صحرا بہ
لیکن چہ کنم کارے با انجمنے دارم

اس مقام پر میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جو کچھ میں آئندہ سطور میں پیش کروں گا، آپ اس سے متفق ہوں یا نہ لیکن اتنا ضرور کیجئے کہ میری گزارشات پر ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجئے اور انہیں محض جذبات کی شعلہ فشانیوں کی نذر نہ کر دیجئے اور دوسرے یہ کہ ان پر نگاہِ تعمق غور کیجئے کہ ان میں بہت سی باتیں شاید آپ کے سامنے پہلی مرتبہ آئیں اور ان پامال راہوں سے کچھ الگ راستے دکھائیں جن پر ہم آنکھیں بند کر کے چلنے کے خوگر ہو رہے ہیں۔

اور اگر آپ میری تشخیص سے متفق ہوں تو پھر سوچئے کہ اس مزمن مرض کے لئے قرآن نے جو علاج تجویز کیا ہے اسے کس طرح، بلا مزید توقف و تربص عملاً شروع کر دیا جائے۔

انما اعظکم بواحدۃ ان تقوموا للہ مثنیٰ وفرادیٰ ثم تتفکروا ۔ (۳۴/۴۶)

(میں تمہیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ تم دو دو ایک ایک کر کے اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ اور پھر غور کرو کہ قرآن جو کچھ کہتا ہے اس پر کس طرح عمل کیا جائے)

سوال زیرِ غور کی بنیاد اس دعوے پر ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں بھی مسلمان آباد ہیں وہ غیر مسلموں کے مقابلہ میں نکبت و زبوں حالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ دعویٰ ایک ایسی صداقت ہے جسے بطور ایک حقیقتِ ثابتہ کے، ہر جگہ بلا شک و شبہ تسلیم کیا جاتا ہے اس لئے اس دعوے کے اثبات کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ ابھی اگلے دنوں (شروع دسمبر ۱۹۴۹ء میں) کراچی میں انٹرنیشنل اسلامک اکنامک کانفرنس (بین الملی اسلامی اقتصادی مؤتمر) کا انعقاد ہوا جس میں تمام اسلامی ممالک (یعنی مسلمانوں کی سلطنتوں) کے نمائندے جمع تھے۔ ان مندوبین کو خطاب کرتے ہوئے محترم غلام محمد صاحب نے اپنے خطبۂ افتتاحیہ میں ان اقدار و عناصر کو ایک ایک کر کے گنایا جو دنیا کے مسلمانوں میں (جن کے نمائندے اس مؤتمر میں شریک تھے) مشترک تھے۔ اس ضمن میں انہوں نے کہا

چوتھا عنصر جو ہم میں بطور قدرِ مشترک موجود ہے، کچھ خوش آئند نہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم سب پست اقوام ہیں اور ترقی میں پس ماندہ۔ مغرب کے مقابلہ میں، جو صنعت و حرفت میں بڑا ترقی یافتہ ہے، ہم نا اہل ہیں

اور ہمارا معیارِ زیست بڑا پست ہے بعض اوقات تاسف انگیز حد تک پست، اور پانچواں عنصر جو اس سے بھی زیادہ ہماری بدبختی کا آئینہ دار ہے، یہ ہے کہ اگرچہ ہم سیاسی طور پر کم و بیش آزاد ہیں، اقتصادی طور پر ہم مغربی اقوام کے پنجۂ آہنی کی گرفت میں ہیں..... اور اس سے تو آپ متفق ہوں گے کہ دوسروں کے مفاد و فیصلوں اور قوت کے سامنے اقتصادی زیردستی، آزادی نہیں، آزادی کے فریب آور نقاب میں چھپی ہوئی غلامی ہے۔ اس لئے ہم سب نہ ابھی کامل طور پر آزاد ہی ہیں اور نہ ہی اپنے گھروں کے آپ مالک۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس دعوے کے اثبات کے لئے جس کا ذکر اوپر ہو رہا تھا، اس سے زیادہ کسی دلیل اور شہادت کی ضرورت نہیں۔ اور یوں بھی وہ کونسا دن ہے اور کونسی تقریب، جس میں چار مسلمان اکٹھے ہوں اور اپنی زبوں حالی کی مرثیہ خوانی کرتے دکھائی نہ دیں۔ اپنی حالت پر ماتم، یہ تو ہماری زندگی کا معمول ہو رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ کسی کی سمجھ میں نہ آئے کہ ہمارا ایسا حال کیوں ہو گیا ہے اور اس کی اصلاح کی صورت کیا ہے؟

اب ایک امر توجہ طلب اور ہے۔ ہم نے کہا یہ ہے کہ مسلمان قوت و ثروت۔ دولت و حشمت۔ صنعت و حرفت اور سیاست و مملکت میں غیر مسلموں سے پیچھے اور ان کا آستاں افتادہ ہے۔ اسے ہم نے ان کی نکبت و ذلت سے تعبیر کیا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ عزت اور ذلت کا یہ معیار ہی غلط ہے۔ یعنی جن عناصر کا نام تم نے عزت رکھ چھوڑا ہے اسلام انہیں وجہ عزت قرار ہی نہیں دیتا۔ لہٰذہ جب عزت و ذلت کا معیار ہی غلط ہے تو اس معیار پر مسلمانوں کی حالت کو پرکھنا اور اس پر پروانۂ تنزل پر انہیں پست و ذلیل قرار دینا کب صحیح قرار پا سکتا ہے؟ چنانچہ مذہب پرست طبقہ کی طرف سے اس اعتراض کا جواب ہی یہ دیا جاتا ہے کہ "عزت سب خدا کے لئے ہے" اور خدا کے نزدیک سب سے زیادہ صاحبِ عزت وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے (ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم) اور پرہیزگار (متقی) وہ ہے جو دنیا کی آلودگیوں (تلوثیات) اور خباثتوں سے مجتنب رہے۔ دنیا کا مال و دولت فتنہ ہے۔ انسان جتنا اس فتنہ سے دُور رہے اتنا ہی خدا کے قریب ہو جاتا ہے۔ سب سے زیادہ باخدا وہ ہے جو سب سے زیادہ دنیا سے کنارہ کش ہو۔ دنیا مردار ہے اور اس کا طالب کُتّا۔ مومن دنیا میں اس طرح رہتا ہے جس طرح جیل خانہ میں قیدی۔ دنیاوی زیبائش و آرائش اور تحسین و تزئین حرام ہے اور لذائذ و حظائظ مکروہات۔ دولت و قوت فرعونیت کی علامتیں ہیں اور غلبہ و تسلط ابلیسیت کی سرکشی۔ لہٰذہ یہ مفروضہ ہی غلط ہے تو اس پر قائم کردہ عمارت بھی از بنیاد تا بام غلط۔

اس موضوع پر میں اس سے پہلے اتنا کچھ لکھ چکا ہوں کہ اب کسی تفصیلی گفتگو کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ لیکن چونکہ دنیا اور اس کی کامیابیوں اور کامرانیوں کے لئے یہ باطل تصور "مذہب" کا پیدا کردہ ہے اور "دین" کی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔ اس لئے

اس کے بعض گوشوں کے متعلق کچھ مختصراً عرض کرنا لابدیک ہے۔

انسان دنیا میں رہتا ہے اور ان قوانین طبیعی کے مطابق جو ہر ذی حیات کے لئے جاری و ساری ہیں اُسے زندہ رہنے کے لئے متاعِ دنیا سے متمتع ہونا ناگزیر ہے۔ روٹی، کپڑا، مکان، دیگر ضروریاتِ زندگی ہر جینے والے کے لئے ضروری ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس سامانِ زیست کا محتاجوں اور بھکاریوں کی طرح ملنا سزاوارِ انسانیت ہے یا عزت و تکریم سے حاصل ہونا تقاضائے آدمیت۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس سوال کے صحیح جواب کے لئے نہ کسی افلاطون کے دماغ کی ضرورت ہے نہ ارسطو کی عقل کی۔ ہر ذی شعور انسان، بشرطیکہ اس کی عقل پہ کورانہ تقلید کے پردے نہ پڑ چکے ہوں اور وہ خود سوچنے کی صلاحیت کھو نہ بیٹھا ہو۔ بلا تامل کہہ دے گا کہ ذلت و رسوائی کی روٹی کے مقابلہ میں عزت و آبرو کا رزق ہزار درجہ بہتر ہے۔ اس عزت و آبرو کی روٹی کو قرآن "رزق کریم" کہتا ہے اور اسے سچے مومنوں کا حق قرار دیتا ہے۔

والذین امنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ والذین اووا ونصروا اولٓئک ھم

المومنون حقا۔ لھم مغفرۃ ورزق کریم (۸/۷۴)

اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ اور جن لوگوں نے ان مہاجرین کو پناہ دی اور ان کی مدد کی۔ یہی لوگ ہیں جو سچے مومن ہیں۔ ان کے لئے حفاظت کا سامان اور عزت کی روٹی ہے۔

اس کے مقابلہ میں وہ دوسرے گروہ کا ذکر کرتا ہے (جس کی تفصیل آگے چل کر آئے گی) جو اس دنیا میں ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ لھم فی الدنیا خزی (۲/۱۱۴) "ان کے لئے اس دنیا میں رسوائی ہے" ذلۃ فی الحیاۃ الدنیا (۷/۱۵۲) "ان کے لئے دنیاوی زندگی میں ذلت ہے" "وہ دنیا میں سخت عذاب کے دن گزارتے ہیں۔ عذابا الیما فی الدنیا (۹/۷۴) "ان کے لئے دنیا میں المناک سزا ہے" یہ سزا بھوک اور خوف کا عذاب ہے۔ فاذاقھا اللہ لباس الجوع والخوف (۱۶/۱۱۲) "اللہ نے انہیں بھوک اور خوف کے عذاب کا مزہ چکھایا" یعنی اس دنیا میں سامانِ زیست کا میسر نہ آنا۔ یا میسر آنا، تو اس ذلت و خواری سے میسر آنا جس میں ہر وقت بالادست قوتوں کا خوف سر پہ سوار رہے۔ قرآن کی رُو سے خدا کا عذاب ہے۔ اس کے برعکس طیب اور خوش گوار زندگی کہ جسے خدا کا انعام کہا گیا ہے وہ ہے جس میں ذلت و خواری نہ ہو ولا یرھق وجوھھم قترو لا ذلۃ (۱۰/۲۶) "نہ ان کے لئے روسیاہی ہوگی نہ ذلت و خواری" وہ جنتِ آدم کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ لا تجوع فیھا ولا تعریٰ۔ وانک لا تظمؤا فیھا ولا تضحیٰ (۲۰/۱۱۸-۱۱۹) اس میں نہ بھوک ہے نہ برہنگی۔ نہ پیاس ہے نہ دھوپ، یعنی خوراک، لباس، مکان سب کچھ میسر ہے اور عزت کے ساتھ میسر۔

یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ دنیا میں عزت کی زندگی جس میں سامان زیست کی فراوانی ہو اور اس کے لئے کسی بالادست قوت کا خوف دامنگیر نہ ہو انسانیت کے شایانِ شان زندگی ہے۔ بھوک اور خوف کی زندگی خدا کا عذاب ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ دنیا میں سامانِ زیست اور قوت و شوکت جس سے دوسروں کا خوف باقی نہیں رہتا حاصل کس طرح سے ہوتا ہے؟ قرآن یہ کہتا ہے کہ یہ کائنات طبیعیات کے قانون (PHYSICAL LAWS) کے مطابق چل رہی ہے اس لئے طبیعی زندگی کے لئے سامانِ زیست حاصل کرنے کے لئے طبیعیات کے قانون کی اتباع کرنی ہوگی۔ اس میدان میں ہر انسان برابر ہے۔ مومن اور کافر کی کوئی تمیز نہیں۔ جب دونوں کی طبیعی زندگی ایک ہی قانون کے مطابق چل رہی ہے تو اسبابِ زندگی کے حصول کے لئے قوانین بھی ایک ہی ہوں گے۔ جس طرح ایک غیر مسلم سانس لے کر زندہ رہتا ہے اسی طرح ایک مسلمان کے لئے بھی ہوا وجۂ زیست ہے۔ جس طرح وہ غذا کا محتاج ہے اسی طرح یہ بھی ہے۔ سنکھیا کا اثر دونوں پر یکساں ہوتا ہے۔ جب اس یہودیہ نے رسول اللہؐ کے کھانے میں زہر ملایا ہے تو اس زہر کا اثر حضورؐ کے جسم پر بھی اسی طرح ہوا جس طرح کسی اور دوسرے انسان کے جسم پر ہوتا ہے۔ لہٰذہ متاعِ حیات اور سامانِ زندگی کے حصول کے لئے ہر انسان کے لئے یکساں قانون ہیں۔ اس میں مومن و کافر کی کوئی تمیز نہیں۔ جب خدا نے کہا ہے کہ (سخر لکم ما فی السماوات والارض (پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے ہم نے اسے تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے) تو اس کا مخاطب انسان ہے صرف مسلمان نہیں۔ جو تسخیرِ فطرت کے لئے جدوجہد کرے گا فطرت اپنے چھپے ہوئے خزانے اس کے حوالے کر دے گی۔ اس میں مسلم و غیر مسلم کی تمیز نہیں ہوگی۔ خدا نے آدمی کو "خلیفۃ فی الارض" کہا ہے اور آدمی ہی کو علم الاسماء (علم اشیائے فطرت) دیا ہے۔ لہٰذا جو بھی اس علم سے فائدہ اٹھانا چاہے اٹھالے۔ فطرت اس باب میں نہ کسی سے بخل کرے گی نہ کسی کی رعایت۔ اس کے لئے اس ضمن میں مسلم و غیر مسلم مومن و کافر سب

ف قرآن نے آدمؑ کو خلیفۃ فی الارض کہا ہے لیکن ہم نے اسے خلیفۃ اللہ فی الارض سمجھ لیا، اور جب اس سے یہ دشواری پیش آئی کہ کیا فرعون و نمرود بھی خلیفۃ اللہ ہو سکتے ہیں تو پھر اس "خلافتِ الٰہیہ" کو مومنین کے لئے مخصوص کر دیا۔ حالانکہ قرآن نے آدم کو کہیں خلیفۃ اللہ فی الارض نہیں کہا۔ خلیفہ کے معنی کسی کے پیچھے آنے والا (SUCCESSOR) "جانشین" کے ہیں زمین میں آدمی سے پہلے جو آبادیاں تھیں ان کے بعد آدمی آبادیوں کا جانشین ہے۔ اُن کی جگہ اب یہ آباد ہے۔ اسی آدمی کو خدا نے علم اسماء فطرت دیا تھا جو اس سے پہلی آبادیوں کو حاصل نہیں تھا۔ وہ سلسلۂ ارتقا میں اس سے پیچھے تھیں۔ اس میں مومن و کافر کی کوئی تمیز نہیں۔ یہ تمیز آگے چل کر آتی ہے جہاں ماحصلِ تسخیرِ فطرت کے استعمال کا سوال آتا ہے۔

برابر ہیں۔ ان کا فرق متاعِ فطرت کے استعمال میں جاکر ہوگا جس کی تفصیل ذرا آگے چل کر ملے گی۔ تسخیرِ فطرت کی جدوجہد کے نتائج میں کچھ فرق نہیں ہوگا۔ دیکھئے قرآن کس قدر وضاحت سے کہتا ہے کہ

من كان يريد الحياة الدنيا وزينتها نوف اليهم اعمالهم وهم فيها لا يبخسون (۱۱/۱۵)

جو دنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتا ہے ہم اس کی جدوجہد کا پورا پورا حصل اسے اسی دنیا میں دے دیتے ہیں۔ اس میں ان کے لئے کوئی کمی نہیں کی جاتی۔

تصریحات بالا سے حسب ذیل نتائج ہمارے سامنے آگئے۔

(۱) دنیاوی زندگی میں سامانِ زیست کی فراوانی اور بے خوفی ہی شایانِ شانِ انسانیت ہے۔

(۲) سامانِ زیست تسخیرِ فطرت سے ملتا ہے۔

(۳) فطرت کے ذخائر ہر اس شخص اور قوم کے ہاتھ آسکتے ہیں جو ان کے لئے جدوجہد کرے اس میں مومن و کافر کی کوئی تمیز نہیں۔

(۴) جو تسخیرِ فطرت میں جدوجہد نہ کرے وہ متاعِ حیات سے محروم رہ جاتا ہے۔

(۵) اور متاعِ حیات سے محرومی یا دوسروں کی محتاجی سے اس کا حصول لعنت اور ذلّت کی زندگی اور بڑا کا عذاب ہے۔

اب آگے بڑھئے۔ قرآن کریم میں ایسی آیات بھی ملتی ہیں جن میں "دنیاوی متاع" کو حقیر کہا گیا ہے اور اس کے مقابلہ میں "آخرت" کو عزیز و پائدار۔ یہی وہ آیات ہیں جن سے "مذہب" نے سہارا پکڑا، اور دنیائے ناثبات کی تمام متاع حقیر و ذلیل کو کفار کا حصہ بتادیا۔ اور آخرت اپنے پیاروں کے لئے "مخصوص کرلی"۔ لہٰذا قرآن کے ان مقامات کا صحیح طور پر سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ یہ مقام ذرا مشکل ہے۔ اس لئے مشکل ہے کہ اس میں ایک ایسی بات سامنے آئے گی جو بہتسوں کے لئے شاید بالکل نئی ہو۔ لہٰذا یہ مقام ذرا گہرے غور و فکر کا محتاج ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن انسان کی پیدائش سے لے کر اس کی طبعی موت تک کے عرصہ کو دنیا کی زندگی قرار دیتا ہے اور موت کے بعد پھر زندہ ہونے کو حیاتِ اخروی سے تعبیر کرتا ہے۔ لیکن (اور یہ "لیکن" بہت اہم ہے) دنیا اور آخرت کے الفاظ سے قرآن کا فقط یہی مفہوم نہیں۔ وہ ان الفاظ کو کچھ اور معنوں میں بھی استعمال کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن بہت سے الفاظ کو بطور اصطلاحات استعمال کرتا ہے۔ اور جب تک ان قرآنی اصطلاحات کا صحیح مفہوم نہ سمجھ لیا جائے۔ قرآن کا منشا

اور منطوق سمجھ میں نہیں آسکتا۔ قرآن فہمی کی راہ میں یہ ایک ایسا اہم نکتہ ہے جسے نظر انداز کر دینے سے وہ تمام الجھاؤ پیدا ہو گئے جو آج ہمارے لئے اس درجہ وجہِ پریشانیٔ قلب و نظر بن رہے ہیں اور جن کی وجہ سے ہزار کوشش کے باوجود ہم قرآن کے صحیح مفہوم تک نہیں پہونچ پاتے۔ یہی نہیں کہ ہم قرآن کے صحیح مفہوم تک نہیں پہونچ پاتے بلکہ بعض اوقات قرآنی مفہوم میں اس قسم کی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں جن سے باہر نکلنا مشکل ہو جاتا ہے اور انسان قرآنی آیات کو (معاذ اللہ) چیستاں سمجھنے لگ جاتا ہے۔ لہٰذا قرآن فہمی کی صحیح صورت یہ ہے کہ قرآن کی ان اصطلاحات کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اس کے بعد ان اصطلاحی معنوں سے بات بالکل صاف ہو جائے گی۔ ان اصطلاحات قرآنیہ میں "دنیا" اور "آخرت" کی اصطلاحات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان اصطلاحات تک پہونچنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر سن رکھئے کہ اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ حیات بعد الممات کا عقیدہ صحیح نہیں۔ حیات بعد الممات تو ایک ایسی حقیقت ہے جس پر ہمارے ایمان کی بنیاد ہے۔ لہٰذا آخرت سے جہاں حیات بعد الممات مراد ہے وہاں اس سے فی الحقیقت حیات بعد الممات مراد ہے۔ ہم فقط اس قدر کہنا چاہتے ہیں کہ قرآن نے دنیا اور آخرت کے الفاظ کو صرف اسی مفہوم کے لئے استعمال نہیں کیا بلکہ اصطلاحی طور پر ان الفاظ کو اور معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ اور اس وقت ہمارے سامنے ان ہی اصطلاحی معانی کی وضاحت ہے۔

"دنیا" کے لغوی معنی ہیں "قریبی" اور "آخرت" کے معنی ہیں "بعد میں آنے والا"۔ قرآن کہتا ہے کہ دنیا میں دو قسم کے انسان ہوتے ہیں (انسان یا انسانوں کے گروہ، اقوام)۔ ایک وہ جو ہمیشہ پیش پا افتادہ، قریبی مفاد (IMMEDIATE - GAIN) کے پیچھے لپکتے ہیں۔ ان کی تمام جدوجہد و تازہ مفادِ عاجلہ کے لئے ہوتی ہے۔ ان کے سامنے صرف اپنا آپ ہوتا ہے۔ انہیں اس کی فکر نہیں ہوتی کہ بعد میں آنے والوں کا کیا حشر ہوگا۔ وہ فقط اپنے عیش و آرام کو سوچتے ہیں۔ اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ آنے والی نسلوں پر کیا گزرے گی۔ ان کی ساری جد و جہد "حال" کے لئے ہوتی ہے۔ "مستقبل" کی انہیں کچھ فکر نہیں ہوتی۔ قرآن ان پیش پا افتادہ قریبی مفادِ عاجلہ کو "دنیا" سے تعبیر کرتا ہے اور مستقبل کا نام "آخرت" رکھتا ہے۔ لہٰذا اس کے نزدیک متاعِ دنیا سے مفہوم ہوتا ہے وہ مفاد جو انسان صرف اپنی ذات کے لئے تلاش کرتا ہے۔ اور سامانِ آخرت سے مقصود ہوتا ہے وہ متاع جسے وہ آنے والی نسلوں کے لئے تیار کرتا ہے (قرآن کی رو سے اس باب میں نسل سے مراد کسی انسان یا خاندان کی اپنی ذریت نہیں بلکہ آنے والی پوری انسانیت ہے)۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ جو شخص (یا قوم) مفادِ عاجلہ (صرف اپنے حال کی خوشگواری) کے لئے کوشش کرتا ہے اس کا حال تو خوشگوار ہو جاتا ہے لیکن اس کا مستقبل (آخرت) روشن نہیں ہوتا۔ لیکن انسانیت کی صحیح زندگی یہ ہے کہ انسانی کوششیں صرف حال کی خوشگواری میں ہی صرف نہ ہو جائیں بلکہ آنے والی انسانیت (یعنی مستقبل) کی خوشگواری کے لئے بھی جدوجہد کی جائے۔ وہ کہتا ہے کہ پیش پا افتادہ مفاد

(متاعِ دنیا) بڑی کشش و جاذبیت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اُن کی درخشندگی نگاہوں میں خیرگی پیدا کردیتی ہے۔ اس سے عیش و آرام کی زندگی ملتی ہے۔ اس میں محنت بہت کم کرنی پڑتی ہے اور اس کے نتائج فوراً سامنے آجاتے ہیں لیکن اس نظریہ کے ماتحت زندگی بسر کرنے والی اقوام کی آنے والی نسلیں (مستقبل) تیرہ و تاریک ہو جاتا ہے۔ لہٰذہ اس قوم کا "آخرت" میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ حال کے پیش پا افتادہ مفاد بالکل اُبھرے ہوئے سامنے ہوتے ہیں لیکن مستقبل کے مفاد نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ لہٰذہ مستقبل کے مفاد کے لئے وہی کوشش کرے گا جسے اس کوشش کے اَن دیکھے نتائج پر پورا پورا یقین ہو۔ اسے قرآن "ایمان بالغیب" کہتا ہے یعنی "اَن دیکھے نتائج پر ایمان"۔ دو کسان ہیں۔ ان کے پاس ایک من گیہوں ہے۔ یہی ان کی متاع ہے۔ ان میں سے ایک جاتا ہے اور زمین میں ہل جوت کر اپنی اس متاعِ حیات کو مٹی میں ملا آتا ہے۔ دوسرا اس پر ہنستا ہے اور اپنا گیہوں چکی میں پسوا کر گھر لے آتا ہے۔ اول الذکر کے بچوں کو مکی اور باجرہ کی روٹیوں پر گزارہ کرنا پڑتا ہے اور ثانی الذکر کے بچے مزے سے گیہوں کی روٹی کھاتے ہیں۔ اسے "دنیا کی" (قریبی) خوش حالی نصیب ہو گئی لیکن مستقبل (آخرت) میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ مستقبل اُس دوسرے کسان ہی کا روشن ہوگا جس کے گھر ایک ایک دانہ سات سات سو دانوں کے خوشے اور کھلیان بن کر آئے گا۔ بیج کو فصل بننے تک کا عرصہ تو اسے محنت اور مشقت سے گزارنا ہوگا لیکن اس کے بعد ایک ایسا دائرہ قائم ہو جائے گا کہ اس کا حال (دنیا) بھی خوشگوار ہوگا اور مستقبل (آخرت) بھی روشن۔ لیکن اس کے لئے شرط اولیں اس بات پر ایمان ہے کہ میں نے جو دانہ مٹی میں ملا دیا ہے وہ ضائع نہیں جائے گا۔ کائنات میں ایک اٹل قانون جاری و ساری ہے جو اس دانہ کو کونپل میں تبدیل کر دے گا۔ کونپل ڈنٹھل بنے گی۔ ڈنٹھل میں خوشہ آئے گا اور خوشہ جھولیاں بھر بھر کر اناج دیدیگا۔ اسے اپنی محنت اور کائنات کے اس اٹل قانون کے نتائج پر یقین محکم ہونا چاہئے۔ اگر اس پر یقین نہیں ہے تو یہ کبھی اپنے دانے مٹی میں نہیں ملائے گا۔ یہ بھی دوسرے کسان کی طرح انہیں پسوا کر گھر لے آئے گا۔ کائنات کا یہ قانون جو دانہ کو خوشہ میں تبدیل کرتا ہے "سنۃ اللہ" (قانونِ خداوندی) کہلاتا ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی (ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا) اسی کا اٹل اور غیر متبدل ہونا ہی اس پر ایمان کا ضامن ہوتا ہے۔ اگر کسان کو اس کا یقین نہ ہو کہ دانہ خوشہ ضرور بن جائے گا تو وہ اپنے دانوں کو مٹی میں ملانے کا خطرہ (RISK) بمشکل مول لے۔ نسلے قرنہا قرن کے تجربہ ھ؎ نے بتا دیا ہے کہ فطرت کے اس قانون میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی کہ جب دانہ کو ایک خاص قاعدہ کے مطابق مٹی میں ملایا جائے تو وہ خوشہ میں تبدیل ہو کر رہتا ہے۔ اب یہ دوسری شرط سامنے آئے گی یعنی دانہ کو ایک خاص قاعدہ اور اصول کے مطابق مٹی میں ملایا جائے اور اس کے بعد وقت پر اسے پانی پہونچایا جائے

ھ؎ انسانوں کا تجربہ جو نسلاً بعد نسلٍ متوارث آگے چلا آتا ہے تاریخ کہلاتا ہے اور قرآن تاریخ کو اسی لئے بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اس کے لئے اس نے ذکر کی اصطلاح اختیار کی ہے۔ (تفصیل کسی دوسرے وقت سہی)۔

اب بیک وقت دو کوششیں مصروفِ عمل ہیں۔ ایک فطرت کا غیر متبدل قانون اور دوسرے کسان کی محنت۔ اگر ان دونوں میں ہم آہنگی ہوگی، تو خوشگوار نتیجہ برآمد ہو کر رہے گا (اسے قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں)۔ اگر اس کی کوششیں قانونِ فطرت سے ہم آہنگ نہیں ہوں گی تو اس کی محنت ضائع جائے گی (اولئک حبطت اعمالھم) قانونِ فطرت اور انسان کی کوششوں کی اس ہم آہنگی کو تقویٰ کہا جاتا ہے (وقی کے معنی ہیں گھوڑے کے سموں کو اس طرح گھسنا کہ وہ ہموار ہو جائیں) اب ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ قرآن کہتا ہے کہ قانونِ فطرت حق اور باطل کی کش مکش کا نام ہے حق کہتے ہیں کسی اسکیم کے مثبت پہلو (POSITIVE ASPECT) کو جب وہ ٹھوس نتیجہ کی شکل میں سامنے آجائے۔ اور باطل اس کے برعکس اس کا منفیانہ پہلو (NEGATIVE ASPECT) ہوتا ہے جو تخریب کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ قانونِ فطرت یہ ہے کہ ہر شے کے تخریبی پہلو سے ایک تعمیری پہلو برآمد ہوتا ہے دانہ کا خاک میں مل کر پھٹ جانا[1]، اس اسکیم کا تخریبی پہلو ہے لیکن اس تخریب (DESTRUCTION) سے تعمیر (CONSTRUCTION) کونپل کی شکل میں نمودار ہو جاتی ہے۔ اور یہ سلسلہ اس طرح آگے بڑھتا جاتا ہے کائنات کے ذرہ ذرہ میں یہ قانونِ کش مکش حق و باطل (تخریب و تعمیر)[2] سرگرمِ عمل ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس کش مکش میں غلبہ ہمیشہ حق کا ہوتا ہے یعنی آخر الامر تعمیری پہلو، تخریبی پہلو پر غالب آتا ہے اور اس طرح یہ کائنات اپنے تخلیقی مدارج طے کرتی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ تخلیقِ ارض و سماء بالحق سے یہی مفہوم ہے یعنی کائناتی قانون کا ماحصل تعمیر ہوتا ہے۔

کائنات میں یہ قانونِ خداوندی اشیائے کائنات کے اختیار و ارادہ کے بغیر جاری و ساری ہے لیکن انسان کو اختیار و ارادہ بھی دیا گیا ہے۔ اس لئے انسان اپنی دنیا میں اس قانون کو اپنے اختیار و ارادہ سے نافذ کرے گا۔ یہاں کسان کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو بیج کے دانوں کو قانونِ فطرت کی ہم آہنگی میں سپردِ خاک کر دے۔ اور چاہے تو انہیں چکی میں پسوا کر روٹی پکا لے۔ اگر وہ اپنی محنت کو کائناتی قوانین کا ہم آہنگ بنا دے گا تو اس کی محنت اس طرح بارآور و ثمر بار ہوگی جس طرح آفاقی دنیا میں خدا کا قانون بارآور ہوتا ہے۔ وہاں بھی تعمیری پہلو حق کا تخریبی پہلو (باطل) پر غلبہ ہوگا۔ لہٰذا جو چاہتا ہے کہ آخر الامر تعمیری پہلو غالب رہے اور اس طرح اس کا مستقبل روشن ہو جائے اسے چاہئے کہ وہ قانونِ فطرت کے

---

[1] فالق الحب والنوی (۶/۹۵) "دانہ اور گٹھلی کو پھاڑنے والا" اس صفتِ خداوندی پر شاہد ہے۔

[2] بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغہ فاذا ھو زاھق (۲۱/۱۸) ہم حق (کی تعمیری قوتوں) سے باطل (کی تخریبی قوتوں) پر نشانہ لگائے رہتے ہیں، تو حق کی تعمیری قوتیں باطل کی تخریبی قوتوں کا سر کچل رہی ہیں۔ اور اس کا مآل یہ ہوتا ہے کہ تخریبی قوتیں ختم ہو جاتی ہیں (اور تعمیری قوتیں ٹھوس نتیجہ کی شکل میں باقی رہ جاتی ہیں)۔

ان دیکھے نتائج پر ایمان رکھتے ہوئے اپنی کوششوں کو اس قانون سے ہم آہنگ کردے۔ ایسی قوم کا حال بھی درخشندہ ہوگا اور مستقبل بھی روشن۔

دنیا اور آخرت کے اس اصطلاحی مفہوم کو سامنے رکھئے اور پھر ان مقامات پر غور کیجئے جن میں قرآن نے صرف دنیا (حال کے پیش پا افتادہ مفاد) کو غرض رکھنے اور آخرت (مستقبل) کے مفاد کو متاعِ حقیقی قرار دیا ہے۔ ساری بات واضح ہو جائے گی۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ ہر فرد یا ہر قوم صرف اپنی اپنی ذات کو سامنے نہ رکھے جس سے کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ انسان صرف اپنے ذاتی مفاد ہی کو مقصودِ زندگی سمجھ لیتا ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ مقصودِ زندگی نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود ہے۔ کیونکہ اس سے انسانیت اپنے ارتقائی مدارج طے کرتی اپنے منتہیٰ کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ وہ خود غرض انسانوں (یا اقوام) کو پیش پا افتادہ مفاد پر چھپٹ پڑنے والے قرار دیتا ہے اور ان مفاد کو متاعِ دنیا (قریبی مفاد) سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے برعکس وہ انسان ہیں جو دنیا میں ایسا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں پوری کی پوری انسانیت پروان چڑھے اسے وہ مستقبل کی خوش حالی (آخرت) سے تعبیر کرتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ قرآن کے نزدیک محض قریبی مفاد (دنیا) کے حصول کی جد و جہد کبھی مستحسن قرار نہیں پاسکتی جبکہ اس کے نزدیک حقیقی سعی و طلب انسانیت کے مستقبل کی خوش گواری کے لئے ہونی چاہیے۔ یعنی پوری کی پوری نوعِ انسانی کی خوش حالی (اپنی اور آنے والی نسلوں کی مرفہ الحالی)۔

قرآن ان دونوں گروہوں کی زندگی اور اس کے مآل کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کرتا ہے تاکہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے۔ وہ کہتا ہے کہ جو لوگ محض پیش پا افتادہ مفاد (حال کی بہبود) کی فکر کرتے ہیں انہیں اپنی کوششوں کے نتائج فوراً مل جاتے ہیں لیکن ان کا مستقبل میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

ملے انسانی نظامِ تمدن و معاش میں معاشی زندگی کے لئے قرآن نے ارض کی جامع اصطلاح استعمال کی ہے۔ اور ان آفاقی قوانین کو جو کائنات میں جاری و ساری ہیں سماء کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن چاہتا یہ ہے کہ انسان کی معاشی زندگی (ارض) سماوی قوانین (مستقل اقدار) کے ساتھ ہم آہنگ رہے۔ اس کو تقویٰ کہتے ہیں۔ اگر انسان کی معاشی زندگی مستقل اقدار سے بے نیاز ہو جائے تو اس سے انسانی تمدن میں ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں جنہیں وہ فساد فی الارض کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ اگر اس کی معاشی زندگی مستقل اقدار سے ہم آہنگ ہو تو اس کا نتیجہ انسانی نظامِ اجتماعیہ میں ہموار ہوتا ہے جسے وہ اصلاح کے نام سے پکارتا ہے۔ اعمالِ صالحہ ایسے کام ہیں جو انسانی نظامِ تمدن کی ناہمواریوں کو مٹا کر ان کی جگہ ہمواریاں پیدا کردیں۔ سردست ان اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے تفصیل ان امور کی معارف القرآن (جلد پنجم) میں ملے گی۔ انشاء اللہ۔

فمن الناس من یقول ربنا اٰتنا فی الدنیا وما لہ فی الاٰخرۃ من خلاق - (۲/۲۰۰)

جو لوگ اس نظریہ کے قائل ہیں کہ انہیں قریبی مفاد ہی مل جانے چاہئیں (انہیں وہ مفاد مل جاتے ہیں)
لیکن ان کا مستقبل (کی خوش حالیوں) میں کوئی حصہ نہیں ہوتا -

اس کے برعکس جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ان کا حال اور مستقبل دونوں روشن ہوں انہیں اس کے مطابق حصے مل جاتے ہیں -

ومنھم من یقول ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاٰخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار .
اولٰئک لھم نصیب مما کسبوا واللہ سریع الحساب (۲/۲۰۱)

اور جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ خدا کا نشو ونما دینے والا قانون ایسا کرے کہ ان کا حال بھی مستحسن ہو جائے - اور مستقبل بھی، اور اس طرح وہ (بدحالیوں اور نامرادیوں کے) انسانیت سوز عذاب سے بچ جائیں، تو ان کی کوششوں کے نتائج انہیں اس طرح سے مل جائیں گے - اس لئے کہ اللہ کا قانونِ مکافات (نتائج برآمد کرنے میں دیر نہیں لگاتا (جس وقت وہ پختگی حاصل کر لیتے ہیں ٹھیک اسی وقت ان کا ظہور ہو جاتا ہے) -

قرآن کہتا ہے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ جو قوم مستقبل کی خوش گواریوں اور مرفہ الحالیوں کے لئے جدوجہد کرے، اس کا حال تاریک ہو - اس لئے کہ مستقبل کی خوش حالی کے لئے ابتدائی جدوجہد کے بعد ایک ایسا دائرہ قائم ہو جاتا ہے جس میں حال اور مستقبل کے کنارے ملتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں - کسان والی مثال میں جب وہ ابتدائی مشکلات پر قابو پا کر فصل تیار کر لیتا ہے، تو فصل کے گھر آنے کے ساتھ ہی اس کا حال خوش گوار ہو جاتا ہے اور اس کے بعد وہ پھر اگلی فصل کی تیاریوں میں مصروف ہو جاتا ہے - اس جدوجہد کا ماحصل پھر مستقبل کی مرفہ الحالیوں کی صورت میں سامنے آ جاتا ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح آگے بڑھتا رہتا ہے - اسی لئے فرمایا کہ

للذین احسنوا فی ھذہ الدنیا حسنۃ (۱۶/۳۰)

جو لوگ حُسن عمل کرتے ہیں ان کی یہ دنیا (حال کی زندگی) حسین بن جاتی ہے -
اور حال کے ساتھ، ان کا مستقبل بھی روشن ہو جاتا ہے -

ص۱۴ قرآن نے عمل صالح کو اعمال حسنہ کہہ کر پکارا ہے - حُسن کیا ہے؟ توازن و تناسب (PROPORTION) قائم رکھنے کا نام - اس سے الگ حسن کی اور کوئی تعریف ہی نہیں ہو سکتی - اس لئے جس طرح اعمال صالحہ کے معنی ایسے کام ہیں جو زندگی کی ناہمواریوں کو ہمواریوں میں بدل دیں - اسی طرح اعمال حسنہ کے معنی وہ اعمال ہیں جو زندگی کے مختلف شعبوں میں توازن و تناسب قائم رکھ سکیں - یہی تمام کامیابیوں اور شادکامیوں کی اصل و بنیاد ہیں (تفصیل معارف القرآن میں ملے گی) -

الذین امنوا وکانوا یتقون ۔ لھم البشریٰ فی الحیوٰۃ الدنیا وفی الاٰخرۃ ۔ لاتبدیل لکلمت اللہ ۔ ذالک ھوالفوزالعظیم ۔ (۱۰/۶۴)۔

جو لوگ زندگی کے اس صحیح نظریہ پر جو قرآن نے پیش کیا ہے، یقین رکھتے ہیں، اور پھر اپنی معاشی زندگی کو آسمانی قوانین سے ہم آہنگ کرتے ہیں (تقویٰ)۔ ان کے لئے حال کی زندگی اور مستقبل دونوں میں خوشگواریاں ہیں ۔ یہ خدا کا ایسا محکم قانون ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی ۔ اور یہ بہت بڑی کامیابی اور کامرانی ہے ۔

یہاں تک ہم نے دو گروہ دیکھ لئے ۔ ایک وہ جو صرف اپنے حال کو خوش گوار دیکھنا چاہتا ہے، اور دوسرا وہ جو مستقبل کی درخشندگی پر نگاہ رکھتا ہے ۔ قرآن کہتا ہے کہ اول الذکر گروہ کا حال خوش گوار ہو جاتا ہے لیکن مستقبل میں اس کے لئے کوئی حصہ نہیں ہوتا اور ہو خر الذکر کا حال اور مستقبل دونوں خوش گوار ہو جاتے ہیں ۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ۔

ومن یرد ثواب الدنیا نؤتہ منھا ۔ ویرد ثواب الاٰخرۃ نؤتہ منھا ۔ (۳/۱۲۴)۔

جو صرف حال کی خوش گواریاں چاہتا ہے اسے یہ کچھ مل جاتا ہے ۔ جو مستقبل کی تابناکی کے لئے خواہاں ہوتا ہے، اُسے وہ مل جاتا ہے ۔

خدا کا قانون یہ نہیں کہ صرف حال کی خوش گواریاں چاہنے والوں کی کوششوں کو رائگاں کر دے ۔ وہ پیش پا افتادہ مفاد چاہے انہیں یہ مفاد مل جاتے ہیں ۔ اور جو مستقبل پر نگاہ رکھتے ہیں ان کی کوششیں اسی نہج سے بارآور ہوتی رہتی ہیں ۔ دیکھئے سورۂ بنی اسرائیل میں اس حقیقت کبریٰ کو کیسے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے ۔ فرمایا ۔

من کان یرید العاجلۃ عجلنا لہ فیھا ما نشاء لمن نرید ثم جعلنا لہ جھنم یصلٰھا مذموما مدحورا (۱۷/۱۸)

جو شخص (یا قوم) پیش پا افتادہ (فوری) فائدہ چاہتا ہے، تو ہم اپنے قانون کے مطابق اسے مفادِ عاجلہ (فوری فائدہ) دے دیتے ہیں لیکن مستقبل میں اس کے لئے شعلہ انگیز عذاب ہوگا جس میں وہ اپنے آپ کو بدحال اور ٹھکرایا ہوا پائے گا ۔

یہ ایک گروہ ہوا ۔ اور دوسرا گروہ ۔

ومن اراد الاٰخرۃ وسعیٰ لھا سعیھا ۔ وھو مؤمن ۔ فاولئک کان سعیھم مشکورا (۱۷/۱۹)

لیکن جو انسان (یا قوم) مستقبل کا طالب ہو ۔ اور اس کے لئے جیسی کوشش کرنی چاہئے ویسی کوشش کرے ۔ اور وہ اپنی کوششوں کے ان دیکھے نتائج پر ایمان رکھے (کہ ایمان کے بغیر یہ کوشش ناممکن ہے)

تو ان کی یہ کوششیں پھلا پھولا پھل لائیں گی۔

یہ فطرت کا قانون ہے۔ نہ اول الذکر گروہ کی کوششیں ضائع جاتی ہیں اور نہ ثانی الذکر کی۔

کلا نمد ھؤلاء وھؤلاء من عطاء ربک۔ وما کان عطاء ربک محظورا۔ (۲۰/۱۷)۔

ہماری نشوونما دینے والی سہولتیں (عطاء ربک[1]) دونوں گروہوں کو آگے بڑھاتی چلی جاتی ہیں تیرے رب (کے قانونِ نشوونما) کی بخشش عام کسی پر بند نہیں ہوتی۔

ان کوششوں میں ہر قوم اپنی اپنی جدوجہد کے مطابق آگے بڑھتی جاتی ہے۔ انظر کیف فضلنا بعضھم علی بعض (۲۱/۱۷) "تاریخی نظائر پر غور کرو اور دیکھو کہ ہمارا یہ قانون کس طرح مختلف قوموں کو ایک دوسرے سے بڑھاتا چلا جاتا ہے" لیکن آخر الامر ہوتا یہ ہے کہ صرف حال کی خوش گواریاں چاہنے والے مٹ جاتے ہیں اور مستقبل کی مرفہ الحالیوں کے طالب بلند مدارج حاصل کر لیتے ہیں۔ وللآخرۃ اکبر درجت واکبر تفضیلا (۲۱/۱۷) "مستقبل کے درجات اور معاشی خوشحالیاں[2] سب سے بڑھ کر ہیں" اور مستقبل صرف اسی کے لئے ہوتا ہے جو معاشی زندگی کو ابدی قوانین و مستقل اقدار کے تابع رکھے۔ اور اس طرح "ارض و سما[3]" میں ہم آہنگی پیدا کرے۔ لیکن جو قوم دنیا کی زندگی کے لئے کوئی الگ خدا تجویز کرے (یعنی یہاں کی زندگی کے لئے اور قوانین وضع کرے) اور آخرت کے لئے اور قوانین سامنے رکھے، تو یہ وہ شرک[4] ہے جس کا نتیجہ بدحالی اور درماندگی کے سوا اور کچھ نہیں۔

لا تجعل مع اللہ الٰھا آخر فتقعد مذموما مخذولا (۲۲/۱۷)

اور اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود (سرچشمۂ قانون) نہ ٹھہراؤ۔ ورنہ ایسے ہو رہو گے کہ ہر طرف سے نفرین کے مستحق اور ہر طرف سے درماندگی میں پڑے ہوئے۔

---

[1] قرآن میں ربوبیت اس قانون کا نام ہے جو نشوونما دیتا ہے۔ عطاءِ ربانی وہ سہولتیں ہیں جو نشوونما کے لئے عام ملتی ہیں۔ ہوا، دھوپ، بارش، زمین، سب کے لئے بلامزد و معاوضہ عام ہیں۔ یہ نہیں کہ حال کی خوش گواریاں چاہنے والوں پر یہ عمومی بخششیں بند ہو جائیں اور مستقبل چاہنے والوں پر اس کے دروازے کھل جائیں۔ خدا کا قانون مومن و کافر دونوں کے لئے یکساں ہے دونوں کو اس قانون کے مطابق نتائج ملتے چلے جاتے ہیں۔

[2] قرآن میں فضل کا لفظ معاشی خوش حالیوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔

[3] "ارض و سما" قرآن میں اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ اس کی تفصیل معارف القرآن میں ملے گی۔

[4] شرک کے یہ معنی ہیں کہ انسان زندگی کے ایک دائرے میں کوئی اور قانون سامنے رکھے اور دوسرے دائرے میں کوئی اور قانون۔

لیجئے! یہ ایک تیسرا گروہ سامنے آگیا۔

گروہ اول ـــــ وہ لوگ جو اپنے حال کی زندگی ہی کو زندگی سمجھتے ہیں۔ وہ مستقبل کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ انہوں نے اپنے حال کی زندگی کی کامیابیوں کے لئے تدابیر وضع کر رکھی ہیں۔ اور وہ ان تدابیر پر عمل کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان سے انہیں پیش پا افتادہ مفاد حاصل ہوتے جاتے ہیں۔ اس گروہ کو کفار کا گروہ کہہ لیجئے۔ یعنی جو مستقبل سے یکسر منکر ہے۔ آج اقوام مغرب اسی گروہ سے متعلق ہیں۔

گروہ ثانی ـــــ وہ گروہ ہے جو حال اور مستقبل دونوں کو سامنے رکھتا ہے۔ اس کے لئے اس کے پاس ایک ضابطۂ حیات ہے جو حال اور مستقبل (دنیا اور آخرت) میں کوئی حد فاصل قائم نہیں کرتا۔ ان کا حال اور مستقبل دونوں روشن اور تابناک ہوتے ہیں۔ فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ۔ اس گروہ کو قرآن مومنین کی جماعت کہتا ہے۔

اور تیسرا گروہ وہ ہے جو حال اور مستقبل کو دو الگ الگ دنیائیں قرار دیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ کچھ کوششیں ایسی ہیں جو صرف دنیا کی کامیابی عطا کرتی ہیں اور کچھ ایسی جو عاقبت سنوارتی ہیں۔ اس کے نزدیک یہ ضروری نہیں کہ جس کی عاقبت سنور رہی ہو اس کی دنیاوی زندگی بھی کامیاب ہو۔ بلکہ اس کے برعکس وہ یہ سمجھتا ہے کہ جس کی دنیاوی زندگی نامراد و ناکام ہو اس کی آخرت کامیاب و کامران ہوتی ہے۔ یعنی اس کے نزدیک دنیاوی زندگی کی خوش حالیوں اور ناداریوں کے لئے کوئی اور قانون کارفرما ہے اور اُخروی کامیابیوں اور ناکامیوں کے لئے کوئی اور قانون۔ وہ ان دونوں کے لئے قانون کا سرچشمہ ایک نہیں سمجھتا۔ وہ ہر دو دوائر میں الگ الگ "خداؤں" کا قانون رائج سمجھتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ دو کشتیوں میں پاؤں رکھ کر دریائی سفر طے کرنے والا ڈوب کر رہے گا۔ جو درخت کی جڑ میں آگ جلاتا ہے اور پتوں پر پانی چھڑکتا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ ایک انسان کے جسم کے ایک حصہ کا خون صالح ہو سکتا ہے اور دوسرے حصہ کا کثیف۔ اس کا ایمان ہے کہ پودے کی اولیں کونپل مرجھا کر خشک ہو تی ہے تو ہونے دیجئے۔ خوشے دانوں سے بھرے ہوئے ملیں گے۔ اس لئے کہ اس کے نزدیک کونپل کے لئے الگ قانون ہے اور ڈنٹھل اور خوشوں کے لئے الگ قانون۔ قرآن کہتا ہے کہ جو شخص (یا قوم) حیاتِ کائنات سے متعلقہ قانونی وحدت (UNITY OF LAW) کے اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے، اسے کہہ دیجئے کہ اس کا حال بھی بدحال ہو گا اور مستقبل بھی تاریک۔ غور کیجئے۔ قرآن اس باب میں کس قدر ابھرے ہوئے الفاظ میں حقیقت کو واشگاف کرتا ہے جب وہ کہتا ہے۔

افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض۔ (۲/۸۵)۔

کیا تم قانونِ کائنات کے ایک حصہ پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصہ سے انکار کرتے ہو؟

جو ایسا کرتا ہے۔

فما جزاء من یفعل ذالک منکم الا خزی فی الحیات الدنیا ویوم القیامۃ

یردون الی اشد العذاب (۲/۸۵)

جو تم میں سے ایسا کرے (خواہ وہ اپنا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لے) اس کا انجام اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا کہ اس کے لئے دنیاوی زندگی میں بھی ذلت و رسوائی ہوگی اور قیامت کے دن وہ سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

اس ہیچ زندگی کا نام قرآن "کفر ببعض الاسلام" (۲/۸۵) قرار دیتا ہے اور اس گروہ کو "منافقین" کی جماعت سے تعبیر کرتا ہے اور ان کے حال اور مستقبل دونوں کو تاریک بتاتا ہے (عذاب الیما فی الدنیا والاخرۃ - ۹/۷۴) اور واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ معاشی زندگی میں ان کا کوئی پرسان حال اور مددگار نہیں ہوتا (وما لھم فی الارض من ولی ولا نصیر۔ ۹/۷۴)

تصریحات بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ قرآن کی رو سے۔

ایک گروہ وہ ہے جس کی حال کی زندگی، کامیابی اور کامرانی کی زندگی ہوتی ہے لیکن اس کا مستقبل تاریک ہوتا ہے

ایک گروہ وہ ہے جس کا حال اور مستقبل دونوں روشن ہوتے ہیں۔

تیسرا گروہ وہ ہے جس کا حال اور مستقبل دونوں تاریک ہوتے ہیں۔

اس کے نزدیک ایسا گروہ کوئی نہیں ہو سکتا جس کا مستقبل تو روشن ہو لیکن حال تاریک ہو جس کا حال تاریک ہے اس کا مستقبل بہرحال تاریک ہے۔ من کان فی ھذہ اعمی فھو فی الاخرۃ اعمی۔ جو یہاں اندھا ہے وہ وہاں بھی اندھا ہوگا۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ کسی کی دنیاوی زندگی ذلت و خواری میں گزرے اور عاقبت سنور رہی ہو۔ جو ایسا کہتا ہے وہ حال اور مستقبل کی نشو و نما کے لئے الگ الگ خداؤں کا قانون ماننا چاہتا ہے۔ یہ شرک ہے، منافقت ہے، ایمان نہیں ہے۔

ملہ قیامت کے قرآنی مفہوم کے لئے معارف القرآن کی آخری جلد تک کا انتظار کرنا پڑے گا۔

قرآن آیا تو اس نے دیکھا کہ ساری دنیا نے حیاتِ انسانی کو طول اور عرض دونوں سمتوں میں بری طرح سے ٹکڑے ٹکڑے کر رکھا ہے۔ طول میں یوں کہ اس نے دنیا اور آخرت کو الگ الگ دنیائیں تصور کر رکھا ہے۔ دنیا اہلِ حکومت کے سپرد ہے جو حال کو کامیاب بنانے کے مدعی ہیں۔ آخرت ارباب مذہب کے قبضہ میں ہے جو لوگوں کی عاقبت سنوارنے کے دعویدار ہیں۔ عرض کی سمت دیکھا تو ہر فرد اپنے آپ کو الگ حیات کا پیکر سمجھتا ہے۔ اور اگر زندگی کی بعض ضروریات، کچھ انسانوں کو ایک جگہ جمع بھی کر دیتی ہیں (جنہیں شعوب و قبائل و اقوام کہا جاتا ہے) تو وہ گروہ صرف افراد کا مجموعہ بنتے ہیں، وحدتِ حیات کے مظہر نہیں ہوتے۔ یہ تھی ساری آباد دنیا کی حالت نزولِ قرآن کے وقت۔ وہ حالت جس نے اسے "فسادُ فی البر والبحر" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے اور شرک کہہ کر پکارا ہے۔

قرآن نے کہا کہ حیات کی اس طرح تقسیم، نفسِ واقعہ (FACTS) کے خلاف ہے۔ حیاتِ انسانی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت (INDIVISIBLE UNIT) ہے۔ وہ نہ طول کی طرف بٹ سکتی ہے نہ عرض کی سمت۔ طول کی سمت، یہ ایک جوئے رواں ہے جس کا ہر قطرہ، ندی کا لاینفک حصہ ہے اور یہ ندی ازاول تا آخر ایک ہی ندی ہے مسلسل و متواتر۔ غیر منقسم و غیر منقطع۔ ابد سے ازل تک کی صراطِ مستقیم پر مختلف نشانات، صرف گزرگاہوں کے نشانات ہیں۔ اور بس۔ اس لئے یہاں دنیا اور آخرت (حال اور مستقبل) کی تمیز، نفسِ واقعہ کے خلاف ہے۔ لہٰذا یہ بھی غلط کہ حال کے متعلق اربابِ حکومت کے قوانین عمل پیرا ہوں اور مستقبل کے متعلق، علماءِ مذہب کے آئین و دساتیر۔ دوسری جانب، عرض کی سمت آیئے تو مختلف افراد ایک نفسِ حیات کے مظاہر ہیں۔ اسی طرح جیسے قمقمے، پنکھے، مشینیں سب بجلی کی ایک لہر (ELECTRIC CURRENT) کے حرکیاتی مظاہر ہیں۔ اس لئے افراد، شعوب، قبائل، اقوام کی تقسیم بھی غیر فطری ہے۔ تمام انسانیت ایک خاندان کے افراد، ایک درخت کے پتے اور ایک سمندر کے قطرے ہیں۔

یہ تھی وہ عظیم القدر حقیقت جو قرآن نے دنیا کے سامنے پیش کی۔ اس نے صرف اس حقیقت کو بطور ایک نظریہ ہی کے پیش نہیں کیا بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ انسانی نظامِ تمدن و معاشرت میں اس وحدتِ حیات کا عملی مظاہرہ کس طرح سے ہوگا۔ یہ عملی طریق جس سے یہ عظیم القدر حقیقت ایک زندہ پیکر کی صورت میں سامنے آجاتی ہے، دین کہلاتا ہے۔ لہٰذہ دین نام تھا اس طریقِ عمل کا جس سے ایک طرف حال اور مستقبل (دنیا اور آخرت) ایک غیر منقسم وحدت بن جاتے تھے، اور دوسری طرف تمام افرادِ نوعِ انسانی، ایک عالمگیر برادری کے ایسے اجزاء جیسے سمندر کے قطرات۔ دین کے ارکان و مناسک، اس غیر مرئی حقیقت کو مشہود و محسوس شکل میں سامنے لانے کے ذرائع و اسباب تھے۔ ان ذرائع و اسباب

نے تھوڑے سے عرصہ میں اس حقیقتِ مجردہ کو لباسِ مجاز میں بایں نمط جلوہ طراز کر دکھایا کہ فرشتوں کی آنکھوں نے بھی یہ دیکھ لیا کہ "انما اعلم ما لا تعلمون" سے مفہوم کیا تھا! دین کے اس نظام کی خصوصیت یہ تھی (یا یوں کہئے کہ اس کا فطری نتیجہ یہ تھا) کہ اقتدار انسانوں کے ہاتھ سے چھن کر اس قانون کے ہاتھ میں آگیا جو قانون اپنی اصل کے اعتبار سے انسانوں کا خود ساختہ نہ تھا۔ اس میں اطاعت فقط قانون کی تھی۔ اور قانون کی اطاعت بھی غلام کی سی اطاعت نہیں بلکہ ایک فطری تقاضے کی تسکین۔ اس طرح جیسے پیاس بجھانے کے لئے پانی پینا فطرت کے ایک تقاضے کی تسکین ہوتا ہے، کسی کی اطاعت نہیں ہوتی۔ اس طرح دین کے نظام میں اقتدار کسی انسان کے ہاتھ میں نہ رہا اور جب اقتدار کسی کے ہاتھ میں نہ رہا تو زندگی کی ناہمواریاں بھی ناپید ہوگئیں۔ اس نظام کے حلقہ میں بسنے والی تمام جماعت کے سامنے زندگی کا مستقبل تھا جس کا فطری نتیجہ یہ تھا کہ ان کا حال خود بخود روشن ہوگیا۔ اس لئے کہ جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں۔ یہ فطرت کا اٹل قانون ہے کہ جس کا مستقبل روشن ہو اس کا حال ضرور تابناک ہوتا ہے۔ دیکھئے، قرآن نے کیسی وضاحت سے اس قانون کو بیان کیا ہے۔

انا لننصر رسلنا والذین اٰمنوا فی الحیٰوۃ الدنیا ویوم یقوم الاشھاد (۴۰/۵۱)

ہم اُن لوگوں کی کھیتیوں کو (جو مستقبل کی خوش حالی پر) ایمان رکھتے ہیں، ان کے حال کی زندگی میں بھی سیراب[1] کرتے ہیں اور مستقبل میں بھی جب نتائج خود کھڑے ہو کر پکاریں گے۔

یہ نہیں کہ یہ نصرت یونہی اتفاقیہ عمل میں آجاتی ہے۔ بلکہ فرمایا کہ کان حقاً علینا نصر المؤمنین (۳۰/۴۷) "ہم پر مومنین کی نصرت فرض ہے۔" غور کیجئے۔ قانونِ خداوندی کی ہمہ گیری اور حکمیت کس قدر واضح انداز سے بیان کی گئی ہے۔ دوسری جگہ اسی جماعت کو مخاطب کرکے فرمایا کہ نحن اولیاء کم فی الحیٰوۃ الدنیا والاٰخرۃ۔ (۴۱/۳۱)۔ "دنیا کی زندگی اور آخرت دونوں میں ہم تمہارے پشت و پناہ ہیں۔" اس نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ مستقبل کی خوش حالیوں کے تمام نظام میں ابتدا محنت و مشقت کرنی پڑتی ہے اور نتائج محسوس طور پر سامنے نہیں آتے۔ اس کے برعکس، مفاد عاجلہ والے تھوڑی سی کوشش سے محسوس نتائج سامنے لے آتے ہیں لیکن بگاڑ

---

[1] نصر کے معنی سیراب کرنا ہے۔ قرآن نے اعمال اور ان کے نتائج کے لئے عام طور پر کھیتی کی مثال دی ہے۔ ارض و سما کا باہمی ازدواج، زمینِ مردہ کی حیات بعد از موت، بیج کا پھوٹنا، کونپل کا ابھرنا، شاخ کا استوار ہونا، خوشے کا پکنا، پھولوں سے جھولیاں بھرنا وغیرہ سب "فلاح" کی تفسیریں ہیں۔ اسی اعتبار سے اس نے نصرتِ خداوندی کو بھی سیرابی سے تعبیر کیا ہے۔

نہیں اے مفاد عاجلہ والے تم پر کبھی غالب نہیں آسکیں گے۔ ولن یجعل اللہ الکافرین علی المؤمنین سبیلا (۴/۱۴۱) ایسا نہیں ہو سکتا کہ خدا کا قانون مستقبل پر ایمان رکھنے والوں پر کفار (صرف مفاد عاجلہ کو سامنے رکھنے والوں) کو غلبہ دیدے" یہ لوگ مفاد عاجلہ کے ڈھیر سامنے دیکھ کر یہ نہ سمجھ لیں کہ زندگی کی دوڑ میں یہ آگے نکل گئے اور اس طرح وہ پیچھے رہ گئے جنہوں نے مستقبل کو سامنے رکھا۔ ان کا یہ گمان غلط ہے بیج بونے والا کسان کبھی اس کے مقابلہ میں ناکام نہیں رہ سکتا جس نے اپنے بیج کے دانوں کو پیس کر روٹی بنالی۔ ولا یحسبن الذین کفروا سبقوا، انھم لا یعجزون (۸/۵۹) مفاد عاجلہ والے یہ گمان نہ کرلیں کہ یہ آگے نکل گئے۔ بالکل نہیں۔ یہ کبھی دوسرے گروہ پر بالادست نہیں ہو سکتے" والعاقبۃ للمتقین۔ انجام کار غلبہ انہیں کا رہے گا جو حال اور مستقبل میں ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں۔ غلبہ پانا تو ایک طرف۔ یہ دونوں برابر بھی نہیں ہو سکتے۔ افمن کان مومنا کمن کان فاسقا، لا یستوٗن (۳۲/۱۸) "کیا مومن اور فاسق دونوں یکساں ہو جائیں گے؟ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے" پھر اس حقیقت کو بھی واضح کردیا کہ کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ حال کی زندگی میں "کفار اور فاسقین" بڑھے ہوئے ہوں گے اور مومنین کا غلبہ صرف حیاتِ اخروی میں ہوگا۔ ان کا حال درخشندہ ہوگا اور ان کا مستقبل۔ قرآن نے اسے بالکل واضح کردیا کہ یہ غلبہ و تسلط اسی دنیا میں ہوگا۔ ام نجعل الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات کالمفسدین فی الارض۔ ام نجعل المتقین کالفجار (۳۸/۲۸) کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم اس دنیا میں (فی الارض) ان کی معاشی زندگی میں (فی الارض) ان کو جو ایمان لائے اور انہوں نے زندگی میں ہمواریاں پیدا کرنے والے کام کئے، ان کے برابر کردیں گے جنہوں نے ناہمواریاں پیدا کرنے والے کام کئے؟ کیا ہم حال اور مستقبل میں ہم آہنگی پیدا کرنے والوں کو ان کے برابر کردیں گے جو ان دونوں میں تفریق کرتے ہیں (فجار)[1] حقیقت یہ ہے کہ ایمان بالآخرت کا فطری نتیجہ عاقبت بینی اور مآل اندیشی ہے۔ سو جو قوم عاقبت اندیش ہو اس کا مقابلہ وہ لوگ کس طرح کر سکتے ہیں جو دور کی بات سوچ ہی نہ سکیں۔

اور ان تمام دعاوی (یا قوانینِ فطرت) کی زندہ شہادت وہ نتائج تھے جو ساری دنیا کے سامنے ہیں۔ کیا اس جماعت سے بڑھ کر جسے قرآن نے مومنین کے خطاب سے پکارا ہے کسی اور جماعت کی آخرت بھی سنوری ہوئی ہوگی

[1] فجر کے معنی ہیں پتھر کی چٹان کو پھٹ کر اس سے پانی بہ نکلنا۔ فجار، دو پہاڑوں کے درمیان کے راستہ کو اور انفجار، پہاڑیوں کو بارود (DYNAMITE) سے اڑا دینے کو کہتے ہیں۔

ہے؟ اور کیا اس جماعت سے بڑھ کر کسی اور جماعت کی دنیا بھی زیادہ کامیاب تھی؟ ان کی حکومت اسی زمین پہ قائم ہو گئی تھی (لیستخلفنھم فی الارض)۔ ان کی جنت یہیں سے شروع ہو چکی تھی[1]۔ رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ۔ انہوں نے اپنی کوششوں کو خدائی قانون سے ہم آہنگ کر لیا تھا، اور خدائی قانون کی انقلاب آفریں قوتیں ان کی کوششوں .... سے ہم آہنگ ہو گئی تھیں۔ نتیجہ دنیا کے سامنے تھا۔

اسلام کی اس سب سے پہلی داعی جماعت نے جو کچھ کر کے دکھایا، وہ یونہی کوئی ہنگامی واقعہ یا اتفاقی حادثہ نہیں تھا بلکہ قانونِ فطرت کا اٹل نتیجہ تھا۔ جس طرح کسی معمل (LABORATORY) میں کیمیاوی تجزیہ اور امتزاج (CHEMICAL ANALYSIS AND SYNTHESIS) سے مخصوص نتائج سامنے آجاتے ہیں۔ اسی طرح انسانی حیاتِ اجتماعیہ میں قوانینِ فطرت سے ہم آہنگی و توافق سے بھی اٹل نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ انہی اٹل نتائج کا نام استخلاف فی الارض تھا جس میں زندگی کو کامل ہمواری اور توازن نصیب ہو گیا تھا۔ اس میں حیات، طول اور عرض دونوں میں اپنی وحدت قائم کئے ہوئے تھی۔ نہ آخرت دنیا سے الگ تھی اور نہ انسانیت ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی۔ انہوں نے تسخیرِ فطرت سے کائنات کی بکھری ہوئی قوتیں اپنے قبضہ میں کی ہوئی تھیں اور اس ماحصلِ فطرت (متاعِ ارض) کو آسمانی قوانین (مستقل اقدار) کے مطابق تقسیم کیا جاتا تھا۔ اس تحصیل و تقسیم کے نظام کا نام دین تھا۔ متاعِ ارضی (دنیاوی اسبابِ زیست) کے حصول کے لئے ہر فرد کی اپنی اپنی بساط کے مطابق پوری جدوجہد اور کامل سعی و کاوش۔ اور اس ماحصلِ متاعِ ارضی کی تقسیم اس انداز سے کہ ہر فرد کو اس کی امکانی قوتوں (POTENTIALITIES) کے نشوونما پانے (FULLY DEVELOPED ہونے) کے لئے پورے پورے اور یکساں مواقع میسر ہوں۔

یہ تھا دین جس میں نہ ملوکیت کی سیادت تھی نہ مذہبی پیشوائی کی قیادت۔ نہ طبقات کی تقسیم تھی، نہ زندگی کی ناہمواریاں۔ نہ دنیا آخرت سے الگ تھی، نہ حال مستقبل سے جدا۔

اب اس کے بعد تاریخ کا ایک ورق اور الٹئے اور ایک عجیب تماشہ دیکھئے۔ وہی قوم تھی اور ان کے ہاتھوں میں وہی قرآن۔ لیکن اب ایک طرف ملوکیت اپنے پورے جبروت و اقتدار کے ساتھ مسلط تھی، اور دوسری طرف مذہبی

---

[1] قرآن کی رو سے جنت اور دوزخ کس طرح اس دنیا سے شروع ہو جاتے ہیں، اسے کسی دوسرے وقت عرض کروں گا۔

پیشوائیت اپنے کامل تقدس اور عقیدت کے ساتھ مستولی۔ انسانیت طبقات میں بٹ چکی تھی اور زندگی کے قدم قدم پر ناہمواریاں در راہ تھیں۔

اس مقام پر فطرتاً یہ سوال پیدا ہوگا کہ اگر وہ نظامِ دین اس طرح فطرتِ انسانی کے مطابق تھا تو وہ پھر ابدی طور پر کیوں نہ چلا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کی جگہ پھر وہی غیر فطری نظام کہن کیوں مسلط ہو گیا۔

میں اس سوال کا جواب متعدد بار دے چکا ہوں[1] اس لئے اس وقت اس کی تفصیل میں نہیں الجھوں گا۔ آپ اس وقت صرف اتنا دیکھئے کہ دین کے جس نظام کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، وہ نظام فطرتِ انسانی کے تقاضوں کو پورا کرنے کا ضامن ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اگر آپ اس نظام کی کفایت کو تسلیم کرتے ہیں تو سردست اس بحث میں نہ جائیے کہ وہ مستقل طور پر قائم کیوں نہ رہا۔ دیکھئے صرف یہ کہ اگر اسی نظام کو پھر سے قائم کر لیا جائے تو انسانیت جگمگا اٹھے گی یا نہیں۔ ویسے بھی اس وقت میرے مخاطب وہ لوگ ہیں جنہیں یہ تسلیم ہے کہ اس نظام میں اس کی صلاحیت موجود ہے کہ وہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کی تمام ناہمواریوں کو مٹا کر کاروانِ زندگی کو پھر سے متوازن و ہموار راہ پر لے چلے۔ لہٰذا ہمیں اس وقت اس بحث میں الجھنے کے بجائے صرف یہ دیکھنا ہوگا کہ ملتِ اسلامیہ (یعنی موجودہ مسلمان) جس ذلت کی زندگی بسر کر رہے ہیں اس ذلت کے اسباب کیا ہیں اور اس کی اصلاح کی صورت کیا۔

بہرحال یہ آپ نے دیکھ لیا کہ دین کے نظام میں بادشاہت (ملوکیت) کا کہیں نام تک نہ تھا، اور نہ ہی پیشوائیت کو کوئی جانتا تھا۔ اب ہم تاریخ کے جس عہد میں پہونچے ہیں وہاں ملوکیت بھی موجود تھی اور پیشوائیت بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت لازم و ملزوم ہیں۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ دین میں حیات کی وحدت غیر منقطع ہوتی ہے۔ اس لئے اس میں حال اور مستقبل (دنیا اور آخرت) میں کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ ایک ہی قانون ہوتا ہے جو پوری کی پوری غیر منقسم حیات پر حاوی ہوتا ہے۔ ملوکیت[2] سے مراد یہ ہے کہ دنیاوی امور کے لئے قانون کا

[1] معارف القرآن کے کئی ایک مقامات پر اس کے متعلق گفتگو ہو چکی ہے اور آئندہ بھی ہوگی۔ بایں ہمہ اگر سوال و جواب کے ضمن میں مزید توضیحات کی غرض سے اس مسئلہ پر مزید گفتگو کی ضرورت پیش آئی تو میں اس کے متعلق بھی عرض کروں گا کہ یہ سلسلہ آگے کیوں نہ چلا۔ اور یہ بھی کہ اس کے آگے نہ چلنے سے ان اصولوں پر کوئی حرف نہیں آتا جو مستقل اقدار کی حیثیت سے قرآن کی دفتین میں محفوظ ہیں۔

[2] یاد رکھئے قرآن کی رو سے ملوکیت صرف یہی نہیں کہ باپ کے بعد بیٹا وارثِ تخت و تاج ہو جاتا ہے۔ ملوکیت ہر اس نظام کا نام ہے جس میں دنیاوی امور کیلئے قانون کا سرچشمہ قرآن سے الگ ہو، خواہ اس کی شکل بادشاہت کی ہو یا جمہوریت کی۔ یہ الگ بات ہے کہ دین کے نظام میں وراثتِ اقتدار کا تصور یکسر باطل ہوتا ہے کہ اس میں جب انفرادی اقتدار ہی نہیں ہو سکتا تو اقتدار کی وراثت کیسی؟

سرچشمہ الگ تصور کر لیا جائے۔ جب آپ حال اور مستقبل (دنیا اور آخرت) کا تصور تو رکھتے ہوں لیکن دنیاوی امور کے لئے قانون کا سرچشمہ الگ تجویز کریں، تو لامحالہ آپ کو آخرت کے لئے بھی ایک جداگانہ ضابطہ کی ضرورت پڑے گی۔ وہ ضابطہ جو صرف آخرت سے متعلق ہو "مذہب" کہلاتا ہے۔ لہٰذہ ملوکیت اور مذہب، وحدتِ حیات کے ٹوٹنے کے بعد لازم و ملزوم طور پر وجود میں آجاتے ہیں۔ جس طرح پانی کے ایک قطرہ کا تجزیہ کیا جائے تو ہائیڈروجن اور آکسیجن جداگانہ اور متغیر تشخص کے ساتھ وجود میں آجاتی ہیں۔

ملوکیت اگر مذہب کو اپنے اندر سمو لے تو دین وجود میں آجاتا ہے۔ اسی طرح اگر مذہب ملوکیت کو اپنے اندر مدغم کر لے تو دین متشکل ہوجاتا ہے۔ یعنی دین میں ملوکیت اور مذہب کا الگ الگ تشخص باقی نہیں رہتا۔ لہٰذہ ملوکیت اپنے قیام کے لئے ضروری سمجھتی ہے کہ مذہب اپنی جگہ پر قائم رہے۔ اور مذہب اپنے قیام کے لئے ملوکیت کا قیام ضروری سمجھتا ہے۔ اس طرح ان دونوں میں بظاہر کیسر تضاد و تخاصم کے باوجود باہمی سمجھوتہ ہوجاتا ہے۔ کھشتری، براہمن کی رکشا (حفاظت) کرتا ہے اور براہمن کھشتری کو آشیرباد (دعا) دیتا ہے۔ محراب و منبر سے بادشاہ کو ظلِ الٰہی قرار دے کر ایدہ اللہ بنصرہ کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ اور تخت و تاج، مساجد و مکاتب کے لئے جاگیریں وقف کر کے مذہبی سیادت کی حفاظت کرتا ہے۔ مذہب اس کے معاوضہ میں ملوکیت کے استحکام و بقا کے لئے یہ کرتا ہے کہ وہ لوگوں کے دل میں یہ عقیدہ پختہ طور پر جاگزیں کرتا رہتا ہے کہ دنیا قابلِ نفرت چیز ہے۔ یہ دھندے "دنیا داروں" کے لئے ہیں۔ خدا کے نیک بندوں کو دنیاوی امور سے الگ تھلگ رہنا چاہیئے۔ ان کا مقصود و منتہیٰ آخرت کی نجات ہے۔ ان کا محبوب و مطلوب، خدا کا دیدار ہے۔ جو جتنا اس دنیا میں ذلیل ہوگا، اتنا ہی خدا کے ہاں مقرب و مقبول ہوگا۔ وقس علیٰ ہذا۔ اس فسوں سازی سے عوام کی تمام توجہات آخرت پر مرتکز ہو جاتی ہیں اور ملوکیت اپنی ہوس رانیوں اور خوں آشامیوں میں بے زمام ہوجاتی ہے۔ اب ملوکیت کے لئے کوئی خطرہ باقی نہیں رہتا۔ مذہب کی طرف سے لوگوں کو "صبر" (استبداد کے خلاف لب تک نہ ہلانے) کی ایسی تلقین کی جاتی ہے کہ وہ ہر جور و ستم کو خدا کی رحمت سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ ان کے سامنے مقربانِ بارگاہِ خداوندی کی ایسی تصویر کھینچی جاتی ہے کہ وہ مفلسی اور تباہ حالی کو "اللہ کے پیاروں" کی علامات قرار دینے لگ جاتے ہیں۔ یوں مذہب کی فسوں کاریوں سے ملوکیت کی جڑیں مضبوط ہوتی چلی جاتی ہیں۔

تاریخ کے قدیم ایام میں مذہب کو اپنی ان سیہ کاریوں اور ساحرانہ فریبیوں کے لئے زیادہ کاوش نہیں کرنی پڑتی تھی

ھ۔ واضح رہے کہ "مذہب" کا لفظ بھی غیر قرآنی ہے۔ سارے قرآن میں یہ لفظ کہیں نہیں آیا۔ وہاں صرف دین کا ذکر ہے۔

دین کے مخالف (جو حضرات انبیاء کرام کے وساطت سے انسانوں کو ملتے تھے) محفوظ نہیں رہتے تھے۔ اس لئے ارباب مذہب کے لئے یہ آسان تھا کہ جو کچھ جی میں آیا اُسے "کتاب اللہ" کہہ کر سنا دیا۔ یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ۔ لیکن اسلام کے معاملہ میں صورت مختلف تھی۔ یہاں دین کا ضابطہ (قرآن) اپنی اصل شکل میں موجود تھا اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا تھا۔ اس لئے اب مذہب کو اپنے منصوبوں کا ریوں کے لئے کاوش کرنی پڑی۔ اب کامیابی کی صورت یہی ہو سکتی تھی کہ دین کے ضابطہ (قرآن) کے الفاظ اور اس نظام کے ارکان کو تو علیٰ حالہٖ قائم رکھا جائے لیکن ان کے مقصود و مفہوم کو یکسر بدل دیا جائے۔

چنانچہ مذہب نے -----------------)

یہ عقیدہ عام کیا کہ کلام الٰہی (ضابطہ دین - قرآن کریم) کے الفاظ میں برکت ہے (معنوں میں نہیں۔ الفاظ میں) انہیں صرف دہراتے رہنا چاہیئے (جس طرح ہندو مذہب میں منتروں کے الفاظ دہرائے جاتے ہیں) اسے تلاوتِ قرآن کہتے ہیں یعنی بے سمجھے الفاظ کو دہراتے رہنا۔ (حالانکہ تلاوت کے معنی ہی کسی کے پیچھے چلنا یعنی پیروی کرنا ہیں) دیکھئے اس ایک حیلہ سے مذہب اپنے مقصد میں کس قدر کامیاب ہو گیا۔ دین کا ضابطہ (قرآن) بھی مسلمانوں کے سامنے رہا اور انہیں قرآن سے یکسر الگ بھی کر دیا۔ مذہب نے تلاوتِ قرآن (یعنی بے سمجھے اس کے الفاظ کو دہراتے رہنے) کے ثواب میں ایسے ایسے سبز باغ دکھائے کہ ساری قوم اس میں الجھ کر رہ گئی۔ حالانکہ اسی قرآن میں منافقوں کے متعلق یہ مذکور ہے کہ یقولون بافواھھم ما لیس فی قلوبھم (۳/۱۶۷) "وہ زبان سے وہ کچھ کہتے ہیں جو اُن کے دل میں نہیں ہوتا"۔ بلا سمجھے الفاظ کے دہراتے رہنے سے بھی یہی ہوتا ہے کہ انسان زبان سے وہ الفاظ ادا کرتا رہتا ہے جن کا کوئی مفہوم اس کے دل میں نہیں ہوتا۔

ذرا آگے بڑھئے تو عجم تفاسیر کے ذریعے اُن تمام اصطلاحات کو جنہیں دین نے اپنے نظام کو سمجھانے کے لئے اختیار کیا تھا نئے معنی پہنانے شروع کر دیئے جس سے ہر بات "آخرت" سے متعلق ہو جائے اور لوگوں کی نگاہوں میں "دنیا" ذلیل و قابلِ نفرت شے بن جائے۔ اعمال، جزا، سزا، حسنات، سیأت، فلاح، خسران، عزت، ذلت، سرخروئی، روسیاہی، سب کے سب "آخرت" پر اٹھا کر رکھ دیئے گئے۔

اب آئی "دین" کے اُن ارکان کی باری جو اس نے اپنے نظام کے قیام کے لئے تجویز کئے تھے کہ صلوٰۃ، صیام، زکوٰۃ، حج، یہ سب ذرائع تھے نظام دین کے قیام و استحکام کے لئے۔ مذہب نے انہیں رسوم بنا کر مقصود بالذات قرار دے دیا۔ یعنی یہ اعمال کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں بلکہ ان کی ادائیگی ہی مقصود ہے۔ اور بس۔

جن طبائع میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس طرح قرآن کے الفاظ دہرانے یا ارکان اسلام ادا کرنے سے حاصل کیا ہوتا

ہے ؟ تو ان کی تسکین کے لئے کہہ دیا کہ ان سے ثواب[1] حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ ملے گا آخرت میں جا کر۔ ثواب کا لفظ ایسا مبہم ہے کہ اس کا کوئی مفہوم ذہن میں نہیں ہوتا۔ جہاں کوئی بات نہ بنے وہاں کہہ دیجئے کہ اس سے ثواب ہوتا ہے۔ آپ کہنے والے سے کہئے کہ صاحب! ثواب عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کی جگہ اپنی زبان کا کوئی لفظ ارشاد فرما دیجئے تاکہ بات واضح ہو جائے۔ وہ آگے چل ہی نہیں سکے گا۔ اس لئے کہ مذہب کا سارا کھڑاگ ہی موہومات پر ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے ہاں ثواب کا تصور بھی موہوم ہے۔ اس سے کوئی ٹھوس حقیقت یا مشہود نتیجہ سامنے نہیں آتا۔

اب آیا خدا۔ سو اس کے متعلق کہہ دیا کہ وہ آسمانوں میں بیٹھا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور چاہتا ہے کہ ہم اس کی پرستش کرتے رہیں۔ پرستش، ترجمہ ہو گیا عبادت کا۔ دین یہ کہنے کے لئے آیا ہے کہ قوانینِ الٰہیہ کی اطاعت کرو (یعنی اپنی زندگی کو ان سے ہم آہنگ بناؤ) اس کا نام تھا عبادت۔ مذہب نے اسے پرستش سے بدل دیا۔ ایک خاص وقت پر خاص انداز میں خاص قسم کی حرکات و سکنات۔ ان سے اللہ خوش ہو جاتا ہے اور اگر ایسا کچھ نہ کیا جائے تو ناراض ہو کر جہنم کی آگ میں جھونک دیتا ہے

عوام ملوکیت کا استبداد اپنے سامنے دیکھتے تھے۔ مذہب کو اندیشہ تھا کہ کہیں اس سے ان میں ملوکیت کی مخالفت کا احساس نہ ابھر آئے۔ اس کے لئے اس نے یہ عقیدہ پیدا کر دیا کہ دنیا میں سب کچھ خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ کوئی انسان اپنے اختیار سے کچھ نہیں کرتا۔ ان بادشاہوں کی کیا مجال ہے کہ یہ اپنی مرضی سے کچھ کر سکیں۔ یہ ہمارے سامنے یونہی اکڑتے ہیں۔ اللہ کے سامنے ان کی کیا حیثیت ہے۔ اس لئے ان کا کیا مقدور ہے کہ یہ اس کے حکم کے خلاف کچھ کر سکیں۔ لہٰذہ جو کچھ ان کی طرف سے ہوتا ہے سب مشیتِ ایزدی سے ہوتا ہے۔ "خدا شناس" کو یہ زیبا نہیں کہ وہ تیر کو دیکھے۔ اُسے ہر وقت نگاہ تیر انداز پر رکھنی چاہئے۔ اس عقیدۂ تقدیر نے ملوکیت کی گرفت کو فولادی بنا دیا۔ اب ان کی ہر شیطنت خدا کی مشیت کا مظہر قرار پا گئی جس کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔

مذہب نے اپنا جال بچھانے کے لئے یہ تمام حربے استعمال کئے لیکن اس کے باوجود اسے اپنی کامیابی کا کلّی اطمینان نہیں تھا۔ اس لئے کہ لوگ مذہب سے ان تمام باتوں کی سند مانگتے تھے۔ اور قرآن سے ان کی سند ملتی نہیں تھی۔ اس کے لئے مذہب کو ایک بڑی مقدس پناہ ڈھونڈنی پڑی۔ اور یہ تھی روایات پرستی کی پناہ۔ اس میں اسناد سازی بڑی آسان

---

[1] ثواب کے قرآنی مفہوم کے لئے کسی دوسرے وقت کا انتظار فرمائیے۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لیجئے کہ قرآن نے جماعتِ مومنین کے لئے فرمایا ہے کہ فاٰتٰھم اللّٰہ ثواب الدنیا (۳/۱۴۸) یعنی انہیں اللہ نے دنیا میں ثواب (یا دنیا کا ثواب۔ حصہ) بھی عطا کرتا ہے لہٰذہ ثواب کوئی ایسی شے نہیں جس کا تعلق اس دنیا سے نہ ہو۔

تھی جس کسی کے جی میں آیا ایک عربی کا فقرہ گھڑا۔ اس سے پہلے "حدثنا زید عن عمر عن بکر۔ قال قال رسول اللہ" کے الفاظ بڑھائے۔ لیجئے! وہ عربی کا فقرہ مذہب کی سند بن گیا۔ رسول اللہؐ کی ذات گرامی سے جس قدر عقیدت مسلمان کو ہو سکتی ہے وہ کسی دلیل کی محتاج نہیں۔ اس لئے جو قول یا عمل رسول اللہؐ کی طرف منسوب کر دیا جاتا، وہ از خود مقدس اور واجب الاحترام ہو جاتا۔

دین میں تحریف و الحاق کا یہ طریقہ سابقہ مذاہب کی تحریف و الحاق سے بھی زیادہ آسان اور دُور رس تھا۔ اُن مذاہب میں تحریف و الحاق کسی نہ کسی کتاب کے گوشوں کے اندر کرنی ہوتی تھی۔ یہاں کتاب الٰہی کو الگ کر کے رکھ دیا۔ اور "دین سازی" کے لئے کھلا میدان ہاتھ آگیا۔ اب ان تمام اباطیل و خرافات کے لئے جن سے ملوکیت اور مذہب کو تقویت ملتی تھی، مقدس اسناد موجود تھیں۔ جو بات منوانی چاہی اس کی نسبت رسول اللہؐ کی طرف کر دی۔ اب کس کی ہمت تھی جو یہ کہہ دیتا کہ میں رسول اللہؐ کا فرمان نہیں مانتا۔ اگر کسی نے کسی معاملہ میں اتنا کہہ دیا کہ یہ بات تو قرآن کے خلاف معلوم ہوتی ہے تو اس کا نہایت آسان جواب موجود تھا کہ تم قرآن کو زیادہ سمجھتے ہو یا رسول اللہؐ زیادہ سمجھتے تھے۔ کہئے! اس کا کیا جواب تھا؟ اس سے اور آگے بڑھے تو یہاں تک کہہ دیا کہ حدیث، قرآن کے احکام کو منسوخ کر سکتی ہے۔

جب تک روایات سازی کا یہ سلسلہ زبانوں تک محدود رہا، ان میں ہر آن اضافے ہوتے رہے لیکن کچھ عرصے کے بعد انہیں کتابوں میں درج کر دیا گیا جس سے مزید روایات سازی کا سلسلہ رک گیا۔ لیکن مذہب کو ابھی مزید اسناد کی ضرورت رہتی تھی۔ ملوکیت کے نت نئے تقاضے اس کے مقتضی تھے کہ اس کی تقویت کے لئے تازہ ترین اسباب مہیا کئے جائیں۔ اس کے لئے ایک قدم اور آگے بڑھایا گیا۔

دین کا نظام یہ تھا کہ قرآن میں اصولی قوانین دے دیئے گئے تھے جن کی روشنی میں جزئی احکام اپنے اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق ملت نے خود مرتب کرنے تھے۔ یہ تدوین جزئیات "تفقہ فی الدین" (دین کے اصولی قوانین پر غور و فکر کرنے) سے ہوتی تھی۔ دین کا نظام ختم ہوا تو مذہب نے اپنی تقویت کے لئے، روایات کے بعد اس "تفقہ" (فقہ) سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ ان فقہی احکام کی سند کے لئے رسول اللہؐ تک بھی نہیں پہونچنا پڑتا تھا۔ ان کی نسبت "ائمہ فقہ" میں سے کسی کی طرف کرنی ہوتی تھی اور ائمہ فقہ میں جسے جی چاہے شامل کر لیا جا سکتا تھا۔ اب رسول پرستی سے آگے بڑھے تو ائمہ پرستی شروع ہو گئی۔ اس میں ملوکیت اور مذہبیت کو اپنی تقویت کے لئے اور بھی زیادہ سامان مل گیا۔

روایات اور فقہ میں کسی حکم کی سند کو رسول اللہؐ یا کسی امام فقہ تک بہرحال پہونچانا پڑتا تھا۔ اس میں بعض اوقات دشواریاں پیدا ہو جاتی تھیں۔ روایات کتابوں میں مدون ہو چکی تھیں۔ فقہی مسائل بھی رفتہ رفتہ کتابوں میں جمع ہو گئے اور

ائمہ کی فہرست بھی محدود ہوتی چلی گئی۔ اب ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جس میں کسی حکم کے لئے کسی سند کی ضرورت ہی نہ تھی۔ یہ تھا سلسلۂ کشف۔ ایک بزرگ کہہ دیتا تھا کہ مجھے یہ بات کشف سے معلوم ہوگئی ہے۔ اور کشف سے مراد تھی براہ راست خدا سے ہمکلامی۔ یا وہ "علم لدنی" جو بغیر ظاہری اسناد کے رسول اللہؐ سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا چلا آرہا ہے یعنی ختم نبوّت کا عقیدہ بھی ہے اور خدا سے ہم کلامی کا دعوے بھی۔ رسول اللہؐ کے متعلق خدا کے اس حکم پر بھی ایمان ہے کہ بلغ ما انزل علیک (جو آپ پر وحی کیا جاتا ہے اسے سب تک پہونچا دو) اور اس کے ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی کہ رسول اللہؐ نے دین کا مغز کھلے بندوں دنیا تک نہیں پہونچایا تھا۔ اُسے سربستہ راز کے طور پر اس طرح سینہ بہ سینہ آگے منتقل کیا ہے کہ کسی اور کو خبر نہ ہونے پائے۔ یہ تھا تصوّف۔ اس میں "مذہب" اپنے مقصد میں اور بھی کامیاب ہوگیا۔ یعنی مذہب کی بنیاد اسی عقیدے پر ہے کہ دنیاوی امور دنیا داروں کے لئے ہیں اور مذہب کا کام انسان کی عاقبت سنوارنا ہے۔ تصوّف میں یہ عقیدہ اپنی انتہا تک پہونچ گیا۔ اس نے کہا کہ یہ کشف و کرامات، یہ خدا سے ہم کلامی اور رسول کے علم لدنی کی وراثت صرف اُسی کو نصیب ہوسکتی ہے جو دنیا کو یکسر ترک کردے۔ جس کے دل میں دنیا کا ذرہ بھر بھی خیال باقی رہا وہ اس راہ میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ اس مسلک نے ملوکیت کو یکسر بے لگام کردیا۔ اسی جہت سے ہم نے تصوّف کو مذہب کی انتہائی شکل قرار دیا ہے یہاں پہونچ کر دین کا تصور کسی دھندلی سی شکل میں بھی باقی نہیں رہتا۔

جس نظریہ یا پروگرام کی صداقت کا معیار اس کے بدیہی اور ٹھوس نتائج ہوں اس میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ دنیا میں بیس مختلف مقامات پر سائنسدان اپنی اپنی تجربہ گاہوں میں پانی کا تجزیہ کر رہے ہوں۔ ان سب کا نتیجۂ عمل ایک ہوگا۔ اس لئے اس باب میں ان میں کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔ اختلاف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب آپ ٹھوس حقائق کی دنیا (MATTER-OF-FACT WORLD) سے الگ ہوکر محض نظری اور مجرد (ABSTRACT) مباحث میں الجھ جائیں۔ دین کا نظام اپنی صداقت کے لئے ٹھوس نتائج کو معیار قرار دیتا تھا۔ جو اس دنیا میں سامنے آجاتے تھے۔ لہٰذا دین میں اختلاف کی گنجائش ہی نہ تھی۔ ایک قانون۔ ایک نظام۔ اس پر عمل پیرا ہونے والوں کی ایک جماعت ایک نہج فکر، ایک طریق کار، لہٰذا ایک ہی نتیجہ، پھر تشتت و انتشار اور تباین و افتراق کہاں سے آسکتا تھا؟ لیکن جب دین مذہب میں تبدیل ہوگیا تو مذہب کی ساری گفتگو "آخرت" سے متعلق تھی۔ اور آخرت کسی کی آنکھوں کے سامنے تھی نہیں جو یہ معلوم ہوجاتا کہ مذہب کے دعاوی صحیح ہیں یا غلط۔ مثلاً ایک شخص آپ سے کہتا ہے کہ یوں نماز پڑھئے اس سے آپ کی نجات ہوجائے گی۔ دوسرا یہ کہتا ہے کہ نہیں یوں نہیں۔ یوں پڑھئے۔ تب آپ کی نجات ہوگی۔ آپ کے پاس یہ معلوم کرنے کا

کوئی ذریعہ نہیں کہ کس طریق سے آپ کی نجات ہوگی۔ لہٰذہ فطری عقائد اور ان اعمال و رسوم میں جن کے نتائج اگلی دنیا پر اٹھا رکھے جائیں اختلاف لازمی ہے۔ اس لئے اگر دین کی اُمّتِ واحدہ مذہب میں پہونچ کر بہتّر فرقوں میں بٹ جائے، تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے؟ یہ تفریق و تقسیم، یہ تحزیب و تشیّع ایسی چیز تھی جس سے مذہب کو اپنی گرفت کی ڈھیل میں کچھ خطرہ ہو سکتا تھا لیکن اس کے پاس ان خطروں کی روک تھام کے لئے بڑے بڑے مقدس حربے موجود تھے۔ اس نے عجمی سے عربی کا ایک فقرہ (اختلاف امتی رحمۃ) تراشا، اور اسے منسوب کر دیا اس ذاتِ گرامیؐ کی طرف جس کی بعثت کا مقصود تمام نوعِ انسانی کی وحدت تھی۔ جب یہ فقرہ حدیث بن گیا تو اختلاف کے رحمت ہونے میں کیا شبہ باقی رہا۔ قرآن اس گروہ بندی اور فرقہ سازی کو شرک قرار دیتا تھا، لیکن اس حدیث نے اسی شرک کو عینِ رحمت بنا کر دکھا دیا۔

یہ کچھ مذہب کی طرف ہو رہا تھا۔ دوسری طرف دنیا والے (اربابِ ملوکیت) باہم خانہ جنگیوں میں مصروف پیکار تھے دین میں اقتدار اشخاص کے ہاتھوں میں نہیں رہتا لیکن ملوکیت میں تمام کا تمام اقتدار و اختیار انسانوں کے ہاتھ میں آجاتا ہے۔ جب قوت کسی ایک انسان کے ہاتھ میں آجائے، تو ہر شخص یہی چاہے گا کہ وہ قوت اس کے ہاتھ میں ہو۔ لہٰذہ ملوکیت کے نظام میں حکومت کی وحدت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا بھی ضروری تھا۔

چنانچہ مذہب میں حالت یہ ہوگئی کہ ملّت کی عظیم اکثریت کو امورِ دنیا سے نفرت دلا کر "عاقبت سنوارنے" کے گورکھ دھندوں میں الجھا دیا۔ اور نظری مباحث سے ان کی وحدت کو پارہ پارہ کر کے انہیں گروہوں اور فرقوں میں بانٹ دیا۔

دنیا سمٹ کر چند افراد یا چند خاندانوں کے قبضہ میں آگئی اور ان میں اس کی تقسیم پر باہمی کشت و خون شروع ہوگیا۔

لہٰذہ جب امن ہوتا تھا تو ملت مذہبی مباحثات و مناقشات میں الجھی رہتی تھی اور جب اربابِ اقتدار میں باہمی جنگ ہوتی تھی تو مذہب اس جنگ کو جہاد کا نام دے کر ملت کو میدانِ جنگ میں لے جاتا تھا جہاں ایک مسلمان کی تلوار دوسرے مسلمان کے سینے میں پیوست ہوتی تھی۔ اور اس طرح ان میں سے قتل کرنے والا غازی اور قتل ہونے والا شہید قرار دے دیا جاتا تھا۔ حالانکہ قرآن پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ من یقتل مومنا متعمدا فجزاؤہ جہنم خالدا فیہا وغضب اللہ علیہ ولعنہ واعد لہ عذابا عظیما (۴/۹۳) "جو ارادۃً کسی مومن کو قتل کر دے تو وہ سیدھا جہنم میں جائے گا۔ جس میں ہمیشہ رہے گا۔ اور اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہوگی، اور اس کے لئے سخت عذاب تیار رہے گا" یہ خدا کا فرمان تھا لیکن اربابِ مذہب ان قاتلوں کو جنت کے پروانے تقسیم کرتے تھے۔ اس لئے کہ یہی ملوکیت کا تقاضا تھا مذہب کا منصب ملوکیت کا استحکام (اور اس طرح اپنی بقا) تھا۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اگر کوئی شخص بھی اس پر تھوڑے سے وقت کے لئے خالی الذہن ہو کر غور کرے گا تو وہ بلا تامّل اس نتیجہ پر پہونچ جائے گا کہ یہ سب باتیں خلافِ عقل و بصیرت تھیں۔ اس لئے اس کے دل میں لامحالہ یہ سوال پیدا ہوگا کہ مذہب نے اس قسم کی باتوں کو منوا کیسے لیا۔ اسلام نہ سہی، وہ لوگ بالآخر انسان تو تھے۔ اگر وہ قرآنی بصیرت سے نہیں محض انسانی دانش ہی سے کام لیتے تو مذہب کے ایسے گھٹے ہوئے کمزور حربوں کا کبھی شکار نہ ہوتے!

مذہب بھی اس خطرہ کو محسوس کرتا تھا اس لئے اس نے اس کی روک تھام کی بھی فکر کر لی تھی۔

دین اپنی دعوت کی شہادت کے لئے اپنے محسوس 'تعمیری' نتائج پیش کرتا تھا۔ اس لئے اس کی دعوت یکسر علیٰ وجہ و بصیرت تھی (ادعوا الی اللہ علیٰ بصیرۃ انا ومن اتبعنی) لیکن یہی بصیرت مذہب کی دشمن تھی۔ اس لئے مذہب نے یہ عقیدہ پیدا کیا کہ مذہبی معاملات میں عقل کو کچھ دخل نہیں ہوتا۔ مذہب کی دنیا شعور و ادراک کی حدود سے ماوراء ہے۔ اس لئے ان معاملات میں عقل کا کوئی کام نہیں۔ جو عقلی توجیہ طلب کرے گا وہ ابلیسی گروہ میں شامل ہوگا۔ اس لئے کہ جس نے سب سے پہلے عقلی قیاس سے کام لیا تھا 'وہ ابلیس تھا'۔ اس کے برعکس جنت بیوقوفوں کے لئے ہے (اھل الجنت بلہٗ)۔ لہٰذہ جو کچھ تم سے کہا جاتا ہے سوچے سمجھے بغیر اس پر عمل کئے جاؤ۔ مذہب نے اپنے اوّلین مخاطب گروہ سے یہ کہا۔ اور اس کے بعد آنے والی نسلوں سے یہ کہ تم صرف یہ دیکھو کہ تمہارے اسلاف کی روش کیا تھی۔ تم آنکھیں بند کرکے ان کی تقلید کئے جاؤ۔ یہی راہ صواب ہے۔ یہی جنت کا سیدھا راستہ ہے۔

یوں تو مذہب کی طرف سے لایا ہوا ہر نظریہ اور ہر تصور تباہی اور بربادی کا پیغام بر ہوتا ہے لیکن ان میں سے عقیدۂ تقلید کے اثرات سب سے زیادہ تباہ کن اور مضرت رساں ہوتے ہیں۔ غور کیجئے۔ حیوان اور انسان میں مابہ الامتیاز شے کون سی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ عقل ہے۔ اب جس نظریۂ زندگی میں عقل کو سلب کر دیا جائے اس کی رُو سے انسان، حیوان بلکہ حیوان سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے عقل و دانش سے کام نہ لینے والوں کو شر الدواب (بدترین خلائق) اور حیوانات سے بھی گئے گزرے ہوئے قرار دیا ہے (اولائک کالانعام بل ھم اضل) تقلید سے انسان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ لھم قلوب لا یفقھون بھا۔ دل تو ہوتا ہے لیکن اس سے سمجھنے کا کام کبھی نہیں لیتے۔ ولھم اعین لا یبصرون بھا۔ آنکھیں بھی ہوتی ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں۔ ولھم اٰذان لا یسمعون بھا۔ کان بھی رکھتے ہیں لیکن ان سے کبھی سنتے نہیں۔ یہی ہیں جن کے متعلق فرمایا کہ یہ سیدھے جہنم میں جاتے ہیں (۷:۱۷۹)۔ ان کا مسلک زندگی یہ ہوتا ہے کہ جس روش پر اپنے اسلاف کو دیکھا گوش بند و چشم بند ولب بند اس روش پر اندھا دھند چلے جاتے ہیں۔ انھم الفوا اباءھم ضالین۔ فھم علیٰ اثارھم

یجس عون (۳۳/۴۹)۔ ان کا ٹھکانہ جہنم کے سوا اور کہاں ہو سکتا ہے۔ ثم ان مرجعھم لالی الجحیم (۶۸/۳۷)۔ لہٰذا اس حقیقتِ کبریٰ پر غور کیجئے کہ قرآن نے ان کا مقام جہنم بتایا ہے۔ جنت اور جہنم کے قرآنی مفہوم کی تبیین کا یہ مقام نہیں۔ اس کے متعلق کسی دوسرے وقت گفتگو کی جا سکے گی۔ اس وقت صرف اتنا دیکھ لیجئے کہ کائنات میں ہر شے اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جو شے کسی حادثہ سے آگے بڑھنے سے رُک جاتی ہے وہ ختم ہو جاتی ہے۔ آفاقی دنیا کی طرح انسانی دنیا میں بھی یہی قانونِ ارتقا جاری و ساری ہے۔ انسانیت کا ارتقاء علم و دانش کے زور پر ہوتا ہے۔ ہر نسلِ انسانی کے سامنے اس کے ماحول کے موانع و مشکلات ہوتی ہیں جنہیں سر کر لینے سے وہ نسل آگے بڑھتی ہے۔ اسی کا نام تخلیقِ مقاصد ہے۔ زندگی نام ہی تخلیقِ مقاصد کا ہے۔

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم　　　　از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

مقاصد کی تخلیق جدتِ فکر و ندرتِ خیال کی رہینِ منت ہوتی ہے۔ اگر کسی قوم میں فکر کی تازگی باقی نہ رہے، اس کے قوائے فکریہ معطل ہو جائیں تو وہ قوم تخلیقِ مقاصد کی اہل نہیں رہتی۔ لہٰذا وہ قابلِ نمو ذی حیات کے بجائے مٹی اور پتھر کا ڈھیر بن کے رہ جاتی ہے اور مٹی اور پتھر سے جہانِ نو کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود　　　　کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

قرآن ارتقائی منازل طے کرنے والی قوم کو جنت کا مستحق قرار دیتا ہے۔ اور کسی ایک مقام پر رک جانے کا نام جہنم رکھتا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ اس نے جہنم کے ایندھن کے لئے الناس (انسان) اور حجارۃ (پتھروں) کو ایک ہی رشتہ میں شمار کیا ہے (وقودھا الناس والحجارۃ)۔ قانونِ ارتقا کے ماہرین ہمیں بتاتے ہیں کہ جس عضو سے کوئی ذی حیات کام لینا چھوڑ دے رفتہ رفتہ فطرت اس عضو کو بیکار سمجھ کر اس کی افزائش (بلکہ پیدائش) ہی روک دیتی ہے۔ اس طرح جب کوئی قوم سمجھ سوچ سے کام لینا ترک کر دے تو کچھ نسلوں کے بعد اس قوم میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ یہ ہے تقلید کا وہ تباہ کن اور دور رس اثر جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ اس میں کوئی ایک نسل ہی تباہ نہیں ہوتی، اس قوم کی آنے والی نسلیں بھی تباہ ہو جاتی ہیں۔ اس قوم میں انسان پیدا ہی نہیں ہوتے، حیوان پیدا ہوتے ہیں اور حیوان ہی مر جاتے ہیں۔ تقلید کی انہی ہلاکت آفرینیوں اور تباہ کاریوں کے پیشِ نظر قرآن نے اس شد و مد سے اس کی مخالفت کی ہے کہ بایدو شاید۔ اس نے بتایا ہے کہ ہر رسول کا پیغام تقلید کی مخالفت ہوتا تھا اور اسی بنا پر ان کی سخت مخالفت ہوتی تھی۔ وہ انہیں علم و دانش (یعنی دین) کی طرف دعوت دیتے تھے۔ ان کی قوم مسلکِ اسلاف کی تقلید کو حسن کارانہ شیوۂ زندگی ٹھہراتی تھی لیکن خدا کے رسول اس قوم کو اس مسلک کے خلاف جھنجھوڑتے تھے اور قوم اتنی ہی سختی سے ان کی مخالفت کرتی تھی۔ ان کی مخالفت بھی بجا تھی

حیوانات کے ماہرین ہمیں بتاتے ہیں کہ کبھی چمگادڑ (خفاش) کی آنکھیں بھی دوسرے پرندوں کی طرح کھلی ہوئی تھیں۔ چمگادڑوں نے ان سے کام لینا چھوڑ دیا تو اب ان کی آنکھوں کی ساخت ہی ایسی ہوگئی ہے کہ وہ نورِ آفتاب کی تاب ہی نہیں لاسکتے۔ اس لئے ان کا سب سے بڑا دشمن سورج ہوتا ہے۔ وہ تو یوں کہئے کہ ان کا بس نہیں چلتا ورنہ وہ کبھی سورج کو افق سے اُبھرنے نہ دیں۔ رسول دین کی روشنی عطا کرتے تھے اور ان لوگوں کی حالت چمگادڑوں کی طرح ایسی ہوچکی تھی کہ انہیں اس روشنی سے سخت تکلیف پہونچتی تھی۔ اس لئے یہ اس کی مخالفت کرتے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہر رسول کا یہی پیغام تھا اور ہر رسول کی اسی طرح مخالفت ہوتی رہی۔ وہ حضرت نوحؑ کے متعلق کہتا ہے کہ جب انہوں نے دین کی روشنی کی طرف دعوت دی تو آپ کی قوم نے اس دعوت کا یہی جواب دیا کہ ما سمعنا بھٰذا فی آبائنا الاولین (۲۳/۲۴) "ہم نے یہ بات اپنے اسلاف کے ہاں نہیں سُنی" اس لئے ہم اسے تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ یہی جواب حضرت صالحؑ کو ملا جب آپ کی قوم نے کہا کہ اتنھٰنا ان نعبد ما یعبد اٰباؤنا (۱۱/۶۲) کیا تو ہمیں ان کی عبودیت سے روکتا ہے جن کی عبودیت ہمارے اسلاف کرتے چلے آئے ہیں؟" یہی کچھ قومِ شعیبؑ نے کہا (۱۱/۸۷) یہی جواب حضرت موسیٰؑ کو ملا۔ قالوا اجئتنا عما وجدنا علیہ آباءنا (۱۰/۷۸) انہوں نے کہا کہ کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہمیں اس راہ سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو دیکھا ہے؟" یہی قومِ حضرت ابراہیمؑ نے کہا۔ قالوا وجدنا آباءنا کذالک یفعلون (۲۶/۷۴) "انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے اسلاف کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے۔" یہی جواب حضور نبی اکرمؐ کو ملا۔ سورۂ لقمان میں ہے:-

وإذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما وجدنا علیہ آباءنا (۳۱/۲۱)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کی اتباع کرو تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں۔ ہم تو اسی کی اتباع کریں گے جس کی اتباع ہمارے اسلاف کرتے چلے آئے ہیں۔

غور کیجئے۔ قرآن نے دین اور مذہب کا فرق کتنی وضاحت اور شدت سے بتایا ہے۔ مذہب اسلاف پرستی (تقلید) سکھاتا ہے۔ دین اس تقلید سے روکنے کے لئے آتا ہے تاکہ انسان وحی کی اصولی روشنی میں اپنی عقل و خرد سے کام لے کہ یہی شرفِ انسانیت اور احترامِ آدمیت ہے۔ لیکن قرنہا قرن کی تقلید نے ان کی آنکھوں کو چمگادڑ کی آنکھیں بنا دیا ہوتا ہے۔ اس لئے انہیں روشنی سے سخت تکلیف ہوتی ہے اور وہ اس کی مخالفت میں چلا اُٹھتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ہر رسول کی دعوت کے ساتھ یہی ہوتا رہا (۴۳/۲۳) وہ ان تاریخی نظائر و شواہد سے بتانا یہ چاہتا ہے کہ تقلید سے انسانی فطرت اس درجہ مسخ ہو جاتی ہے کہ وہی عقل و دانش جو اس کے لئے مابہ الامتیاز تھی، اسے مار سیاہ بنا کر دکھائی

دینے لگ جاتی ہے۔ تقلید میں چونکہ مستقبل ہمیشہ تاریک اور ماضی درخشندہ نظر آتا ہے۔ اس لئے انسان کی نگاہیں سامنے کی بجائے پیچھے کی طرف رہتی ہیں۔ اس کا منشا الٹا ہوتا ہے (یعنی آنکھیں گُدی کی طرف ہوتی ہیں) یہی جہنم کی زندگی ہے۔ یوم تقلب وجوھھم فی النار ([illegible]) "جس دن ان کے چہرے جہنم میں اُلٹے کر دیئے جائیں گے"۔ یہی وہ اَوندھے منہ چلنے والے ہیں جن کے متعلق دوسری جگہ فرمایا ہے کہ افمن یمشی مکبا علی وجھہ اھدی امن یمشی سویا علی صراط مستقیم ([illegible]) "کیا وہ جو اپنے منہ کے بل اوندھا چلا جا رہا ہو سیدھے راستہ پر ہے یا وہ جو ہموار و متوازن راہ پر سیدھا چلا جا رہا ہو"۔ سورۂ یٰسین میں ہے کہ تقلید سے رسوم کہنہ کے طوق واغلال اس بری طرح سے گردن کو جکڑے رہتے ہیں کہ ان سے گردن اوپر کی اوپر اٹھی رہتی ہے اور انسان کو اپنے سامنے کا راستہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ انا جعلنا فی اعناقھم اغلالا فھی الی الاذقان فھم مقمحون ([illegible])۔ "ہمارے قانون نے ان کی گردنوں میں ایسے طوق ڈال رکھے ہیں جو ان کی ٹھوڑیوں تک چڑھ گئے ہیں جس سے ان کی کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ ان کے سر اوپر کے اوپر کو اُٹھے رہتے ہیں"۔ اور یہ اپنے سامنے کا راستہ دیکھ ہی نہیں سکتے یہی وہ طواق و اغلال تھے جنہیں اُتارنے کے لئے رسول اکرمؐ تشریف لائے تھے (ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم [illegible])۔ جب ایک عرصہ کی تقلید سے قوم کے قوائے فکریہ اس طرح مفلوج ہو جاتے ہیں کہ وہ کام کرنے کے قابل ہی نہیں رہتے۔ تو قرآن کے الفاظ میں اس قوم کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وجعلنا من بین ایدیھم سدا و من خلفھم سدا فاغشینٰھم فھم لا یبصرون ([illegible]) "ہمارا قانونِ فطرت ان کے سامنے بھی دیواریں کھینچ دیتا ہے اور ان کے پیچھے بھی۔ اور (ان کی عقل و خرد پر) پردے ڈال دیئے جاتے ہیں اور ان کی بصارت سلب کر لی جاتی ہے"۔

اسی حقیقت پر باندازِ دگر غور کیجئے۔ ذہنِ انسانی اپنے عہدِ طفولیت میں اتنی استعداد نہیں رکھتا تھا کہ ہر نسل اپنے لئے آپ راہیں تراشے۔ عام راستوں سے ہٹ کر سوچنے والے انسان (یعنی مقاصد کی تخلیق کرنے کے اہل دماغ) بہت کم پیدا ہوتے تھے۔ اسی لئے ہر آنے والی نسل کے لئے یہی راہ آسانی اور احتیاط کی تھی کہ وہ اپنے اسلاف کی باتوں کو جمع کر کے ان پر عمل پیرا ہوتی رہے۔ اسی کا نام تقلید ہے۔ قرآن نے انسانیت کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اس نے کہا کہ اب عقل و علم کے خزانے عام کر دیئے گئے ہیں۔ اب ذہنِ انسانی سنِ رشد و بلوغت کو پہنچ چکا ہے اس لئے اب انسانوں کے لئے صحیح راہِ عمل یہ ہے کہ وہ استقرائی علم سے اپنی راہیں آپ تراشے۔ اس نے انسانی سعی و کاوش کو ناکامیوں اور نامرادیوں سے بچانے کے لئے وہ مستقل اصول دے دیئے جو دورِ زمانہ سے تغیر پذیر نہ ہوں، اور

کہہ دیا کہ ان اصولوں کی روشنی میں ہر نسل اپنے زمانے کے تقاضوں کے حل آپ تلاش کرے۔ گزشتہ نسلوں کا تجربہ (جسے تاریخ کی یادداشتیں کہتے ہیں) بھی کارآمد شے ہے اس لئے قرآن نے اس کی اہمیت کو بھی اُجاگر کیا ہے۔ لیکن اس تجربہ سے متمتع ہونے اور آنکھیں بند کرکے پرانی ڈگروں پر چلے جانے میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ یہ دین کا نظام تھا۔ لیکن مذہب نے آنے والی نسلوں کو اسلاف کی تقلید کی زنجیروں میں جکڑ کر بڑھنے والی انسانیت کو پھر وہیں پہنچا دیا جہاں وہ انسان کے عہدِ طفولیت میں تھی اور اس طرح وہ ان کی تاریخ کو ہزاروں سال پیچھے کی طرف لے گیا۔

مذہب تقلید کے عقیدہ سے انسانوں کو یہاں تک پہونچا دیتا ہے۔ ایسی قوم میں سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیت باقی کیسے رہ سکتی ہے؟

اب آگے بڑھئے۔ دنیا سے تنفر اور علم و عقل سے دشمنی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کائنات کی ہر شے قابلِ نفرت بن جاتی ہے۔ چنانچہ مذہب پرست لوگوں کی نگاہ میں کائنات کے ہر گوشے میں شر ہی شر دکھائی دیتا ہے۔ انہیں ہر حسین شے سے کراہت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر تبسم فشاں چہرہ انہیں موت کا آئینہ دار اور ہر گلفشاں پیشانی انہیں جہنم کا کندہ دکھائی دیتی ہے جب بہار خوشی کے جھولے جھولتی ہے تو وہ ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں۔ جب چاندنی مسکراتی ہے تو وہ منہ بسورتے ہیں۔ ان کے بجھے ہوئے چہرے اور نورِ مسرت سے محروم آنکھیں صاف بتا رہی ہوتی ہیں کہ یہ ان میں سے ہیں جن کی آرزوؤں کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ

آئے مجھے ہنسی بھی تو میں رو دیا کروں!

ادب، موسیقی، آرٹ، سائنس، زیبائش و آرائش کے شگفتہ اسباب و ذرائع ان کے مذہب میں حرام ہوتے ہیں۔ دین، کائنات کے حسن سے بہرہ یاب ہونے اور اس حسن میں نت نئے اضافے کرنے کی تعلیم دینے آتا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ کائنات کی ہر شے اپنے اپنے مقام پر صحیح انداز میں رکھی گئی ہے۔ جب ہر شے اپنے مقام پر رہے تو اس کا ماحصل حسنِ کائنات ہوتا ہے۔ اس حسن (موزونیت) کے قیام و افزائش کے لئے اور تو اور ابلیس کی بھی اپنے مقام پر ضرورت ہوتی ہے کہ حسن کی جلال آفرینیاں اور شعلہ انگیزیاں اسی کی تمازت سے جلوہ تاب ہوتی ہیں۔ لیکن اگر خیر سے خیر شے کو بھی اس کی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو وہ بھی شر بن جاتی ہے۔ حسن موزونیت کا نام ہے اور موزونیت یہی ہے کہ ہر شے اپنے صحیح مقام پر ہو۔ پیسکال کے الفاظ میں "اگر قلوپطرہ کی ناک ذرا چپٹی ہوتی تو تاریخی دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا" دین یہ بتاتا ہے کہ زندگی کے موٹر کار میں پٹرول کے ساتھ موبل آئیل بھی لاینفک ہے۔ شر اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب

موبل آئیل، پٹرول کے ٹینک میں بھر دیا جائے۔ پھر گاڑی آگے نہیں چل سکتی۔ مذہب یہ سکھاتا ہے کہ موٹر میں پٹرول ہی پٹرول ہونا چاہیئے (یعنی حارہ یا بس قسم کا زہد و تورع) اور یا موبل آئیل ہی موبل آئیل (یعنی تصوف اور اس کی شاعرانہ جذبات پرستیاں)۔

آپ قرآن میں دیکھئے۔ چند چیزیں ہیں جنہیں حرام قرار دیا گیا ہے۔ چند باتیں ہیں جن سے روکا گیا ہے۔ اس میں اوامر و نواہی کی فہرست نہایت مختصر ہے۔ باقی امور کے متعلق صرف حدود (BOUNDARY LINES) کھینچ دی گئی ہیں اور انسانی فکر کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے کہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنی دنیا اپنی صوابدید کے مطابق آپ پیدا اور آباد کرے۔ قرآن، حریت فکر پر کم از کم پابندیاں عائد کرتا ہے۔ اس کا مقصود انسانی صلاحیتوں کو ابھارنا ہے۔ قد افلح من زکّٰھا (جس نے نفسِ انسانی کی صلاحیتوں کو اُبھارا اس کی کھیتی ثمربار ہوئی)۔ اس کے برعکس مذہب کو دیکھئے تو وہ انسانی زندگی کے ایک ایک سانس پر داروغے مقرر کر دیتا ہے۔ وہ کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی اس کی اجازت نہیں دیتا کہ انسان اپنی عقل و فکر سے کوئی فیصلہ کر سکے۔ وہ بچہ کی پیدائش سے لے کر انسان کے مرنے تک (بلکہ مرنے کے بعد تک بھی) ایک ایک قدم پر اپنا حکم نافذ کرتا رہتا ہے۔ دایاں قدم اٹھاؤ تو یہ کرو۔ بایاں اٹھاؤ تو یہ پڑھو۔ پانی پیو تو یوں کرو۔ روٹی کھاؤ تو یہ کرو۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ دین نے چند چیزوں کو حرام قرار دیا تھا لیکن مذہب میں حلال اور حرام کی فہرستوں کو دیکھو، کتابوں پر کتابیں بھری ہوئی نظر آئیں گی۔ قرآن میں "مردار، خون، لحم خنزیر اور غیر اللہ کی طرف منسوب کردہ اشیاء" کو حرام قرار دینے کے بعد فرمایا ہے کہ ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب ھذا حلال و ھذا حرام لتفتروا علی اللہ الکذب (۱۶/۱۱۶)" اور دیکھو۔ ایسا نہ کرو کہ تمہاری زبانوں پر جو جھوٹی بات آجائے اُسے بے دھڑک کہہ دیا کرو کہ یہ چیز حلال ہے اور وہ چیز حرام۔ اس طرح (حرام حلال ٹھہرانا) اللہ پر افترا پردازی ہے (اس لئے کہ اللہ نے جن چیزوں کو حرام ٹھہرانا تھا، وہ اس نے حرام قرار دیدی ہیں)" کسی شے کو انسانوں کے لئے حرام قرار دے دینا کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ انسانی آزادی کو بری طرح سے جکڑتا ہے۔ اس لئے دین میں یہ اختیار کسی انسان کو نہیں دیا جاتا۔ اس کا اعلان ہے کہ

قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبت من الرزق (۷/۳۲)

ان سے پوچھو کہ خدا کی زینتیں جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہیں اور کھانے پینے کی اچھی اچھی چیزیں کس نے حرام کی ہیں؟

یعنی خدا کہتا ہے کہ ہمارے سوا اور کون ہے جو کسی چیز کو حرام قرار دے سکتا ہے؟ مذہب کے اجارہ دار تم تک کہتے ہیں کہ ہم ہی جو انہیں حرام قرار دیتے ہیں؟ وہ خدا سے علی الرغم کہتے ہیں کہ تم اپنی حرام کردہ چیزوں کی فہرست کو دیکھو اور پھر ہماری فہرستوں پر نگاہ ڈالو۔ خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ حرام قرار دینے کے اختیارات کس کے وسیع ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ دین جب ملوکیت اور مذہب میں بٹ جاتا ہے تو وہ اختیارات جو خدا نے صرف اپنے قانون تک محدود رکھے تھے، انسانی ہاتھوں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ ارباب حکومت اپنے دائرہ میں انسانوں کو اپنا محکوم بناتے ہیں، اور ارباب مذہب اپنے دائرہ میں انہیں اپنے تابع فرمان رکھتے ہیں۔ یہ حرام، وہ حلال۔ یہ کرو، وہ نہ کرو۔ سب مذہب کے استبدادی فرامین ہیں جو شاہی احکامات سے کسی صورت میں بھی کم نہیں ہیں۔ بلکہ اپنی گرفت کی شدت میں ان سے بھی زیادہ محکم۔ اس لئے کہ شاہی فرامین کا اثر تو وقتی ہوتا ہے لیکن مذہب کا استبداد دل کی گہرائیوں تک پہونچ چکا ہوتا ہے۔ حکومتیں آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں لیکن مذہب کا غلبہ و تسلط ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔ تخت و تاج کی حکومت میں وہ لذت کہاں جو مسانید دعوت وارشاد کی حکومت میں ہے۔

خدا نے انسانی فطرت میں اختیار و ارادہ رکھا تھا۔ دین کا نظام اس اختیار و ارادہ میں وسعتیں عطا کرتا اور اس سے ایسے نتائج پیدا کرتا تھا جن سے انسانیت کو عروج و ارتقا حاصل ہو۔ مذہب اپنے استبدادی احکام سے اس اختیار و ارادہ کو کچلتا ہے۔ لہٰذہ مذہب یکسر غیر فطری زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور کرتا ہے۔ جب آپ خلاف فطرت زندگی پر مجبور کئے جائیں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ

(۱) یا تو آپ کی فطرت مسخ ہو جائے گی اور آپ اختیار و ارادہ کے شرف انسانیت کو چھوڑ کر جمادات و نباتات کی سی زندگی بسر کرنے لگ جائیں گے۔ (مذہب میں قوم کی اکثریت کی یہی حالت ہو جاتی ہے اس لئے وہ تقلید پر رضامند ہو جاتے ہیں)

(۲) یا آپ ان غیر فطری پابندیوں سے ایسی سرکشی اختیار کر جائیں گے کہ پھر آپ ان حدود کا بھی احترام نہیں کریں گے جو نظام انسانیت میں ربط و ضبط پیدا کئے ہوتے ہیں (اس قسم کے سرکش و بے باک انسان بالعموم مذہب گزیدہ ہوتے ہیں)

(۳) اور یا پھر منافقت کی زندگی بسر کریں گے۔

ملہ قرآن تو رسول کو بھی یہ حق نہیں دیتا کہ وہ کسی شے کو حرام قرار دے دے۔ تا بدیگراں چہ رسد!

شق سوم ذرا تفصیل طلب ہے جس طرح ملوکیت کے استبداد میں منافقانہ زندگی، خوشامد کا رنگ اختیار کر لیتی ہے اسی طرح مذہب کی دنیا میں منافقانہ زندگی بھی خوشامدانہ مسلک اختیار کر لیتی ہے۔ اس میں خدا کا تصور ایک جابر و مستبد بادشاہ کا سا قائم ہو جاتا ہے جس سے انسان ڈرتا ہے۔ خوف کھاتا ہے۔ اس لئے اسے خوش رکھنے کے لئے اس کی پرستش کرتا ہے۔ اس کے حضور چڑھاوے چڑھاتا ہے (مذہب میں نماز، روزہ، صدقہ، خیرات اسی خوشامدانہ مسلک کے مظاہر بن جاتے ہیں) اور اس طرح انسان خدا کو خوش کر لیتا ہے۔ اب رہیں مذہب کی غیر فطری پابندیاں۔ انہیں توڑنے کے لئے اس کا جی للچاتا ہے۔ لیکن مذہبی زندگی کا تقدس اسے علانیہ ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے اس کے لئے وہ فریب کارانہ راہیں تلاش کرتا اور بہانے تراشتا ہے۔ وہ حسن فطرت سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کیف اندوز نہیں ہوتا، کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ موسیقی کو حرام قرار دیتا ہے لیکن مزامیر کے بغیر سُن لینے میں کوئی باک نہیں سمجھتا۔ آرٹ اس کے نزدیک سخت قابل نفرت شے ہے لیکن "ہاف ٹون تصویر"[1] اتروا لینے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا۔ حسن اور اس کی نیرنگیوں کا تصور تک بھی اس کے نزدیک جہنم میں پہونچا دینے کے لئے کافی ہوتا ہے لیکن وہ ایک "معشوقِ حقیقی" کی فریب انگیز اصطلاح میں حسن کی شعبدہ کاریوں اور بادۂ گلفام کی کیف باریوں کے سرود آور تذکرے جھوم جھوم کر سنتا ہے اور اس طرح ذہنی تعیش سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ماہرین نفسیات نفسیاتی تجارب کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ اس قسم کے غیر فطری دباؤ (REPRESSION) سے جنسی بدنہادی (SEX PERVERSION)[2] پیدا ہو جاتی ہے جس کے مظاہر بڑے

---

[1] تصویر کے مسئلہ پر ایک مرتبہ ہندوستان کی ایک نامور مذہبی ہستی نے تفصیلی بحث کرنے کے بعد یہ ثابت کیا تھا کہ اوپر کے دھڑ (BUST) کی تصویر اتروانا جائز ہے (اس لئے کہ اس وقت تک ان کی اپنی تصویریں شاید اسی انداز کی اتری ہوں گی) انہیں ذرا ماڈرن بننے کا بھی شوق ہے۔ اس لئے "آدھے دھڑ" کی بجائے انگریزی کی اصطلاح استعمال کرنا چاہتے تھے اس کے لئے انہوں نے "ہاف ٹون" لکھ کر اپنی انگریزی دانی کا مضحکہ اڑایا تھا۔

[2] (SEX PERVERSION) کے لئے کوئی موزوں لفظ اس وقت میرے ذہن میں نہیں آ رہا ہے۔ بدنہادی اس کا پورا پورا مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہے۔ مسخ شدہ فطرت' یا غیر فطری راہوں پر چل نکلنا، اس کے مفہوم سے زیادہ قریب ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ الفاظ بھی (PERVERSION) کا صحیح مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ غوایت کی مکروہ ترین شکل ہوتی ہے۔

گھناؤنے ہوتے ہیں۔ اسی جنسی جذبات کا نتیجہ ہے کہ غیر عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنے کے مدعی دھڑا دھڑ شادیاں کئے چلے جاتے ہیں اور بے حد و شمار لونڈیوں سے تمتع کرنا عین "شریعت حقہ" کے مطابق قرار دیتے ہیں۔ آپ کتب فقہ و روایات کو دیکھئے۔ ان کا کتنا بڑا حصہ جنسیات سے متعلق مسائل پر مشتمل ہوتا ہے۔ اور ان کا ذکر ایسی تفاصیل سے بیان ہوتا ہے کہ اس پر بے حیائی کی آنکھیں بھی جھک جائیں۔ دین نے صرف وہ پابندیاں عائد کی تھیں جو انسانی معاشرہ کے نظم و ضبط کے لئے لاینفک تھیں۔ اور ان کا نتیجہ غیر فطری دباؤ نہیں بلکہ دریا کو طغیانیوں سے بچانے کے لئے اس کے ساحلوں کا تعین تھا۔ مذہب نے اپنے غیر فطری استبداد سے اس دریا کے سامنے بند لگا دیئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا پانی زمین دوز راہوں میں جا چھپا۔ اور جہاں جہاں اسے نرم زمین دکھائی دی وہیں سے سر نکال لیا کہ ابھار پانی کی فطرت کا تقاضا تھا۔ آپ اس تقاضے کو روک نہیں سکتے۔

پری رُو تاب مستوری ندارد چو در بندی ز روزن سر بر آرند

وہ تھیں تباہیاں جو مذہب نے خارجی دنیا میں پیدا کیں اور یہ تھیں وہ خرابیاں جو اس کی وجہ سے دلوں کی داخلی دنیا میں وجود پذیر ہوئیں۔ ان خرابیوں نے پوری قوم کی سیرت کو مسخ کر دیا۔ جب کوئی قوم ایک عرصہ تک اس قسم کی منافقانہ زندگی بسر کرنے کی خوگر ہو جائے تو اس قوم سے جرأت و جسارت، اور کشادگی و شگفتگی کے جوہر سلب ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ پست حوصلگی، اور دون ہمتی، تنگ نظری اور کوتاہ دامنی کے دنائت انگیز عیوب پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن مذہب ان عیوب کو محاسن بنا کر دکھانے کے لئے ایک اور حربہ استعمال کرتا ہے، جسے وہ ضابطۂ اخلاق کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ عاجزی اور ناتوانی کو خدا کے بندوں کی صفات قرار دیتا ہے۔ پست حوصلگی اور دون ہمتی کا نام صبر اور توکل رکھتا ہے۔ فاقہ زدگی کو استغناء کے پرفریب نقاب میں چھپاتا ہے۔ بے عملی کی افیون کو تقدیر الٰہی کا تریاق بنا کر دکھاتا ہے۔ بزدلی کا نام "مرنجاں مرنج" مسلک حیات رکھ دیتا ہے۔ دین یہ کہنے کے لئے آیا تھا کہ وہ ہر فساد انگیز قوت جو رزق کے سرچشموں کو اپنے باپ دادا کی ملکیت قرار دے کر ان پر سانپ بن کر بیٹھ جائے، اس قابل ہے کہ اس کی گردن مروڑ دی جائے۔ مذہب کا ضابطۂ اخلاق اس قسم کی لوٹ کھسوٹ کو "هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي" کہہ کر ان ناہمواریوں اور دراز دستیوں کو کھلا لائسنس عطا کر دیتا ہے۔ چونکہ مذہب کا دائرہ اثر و نفوذ ان ہی افراد تک محدود ہوتا ہے جو اسے اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں، اس لئے ان لوگوں سے وہ اپنے اس ضابطۂ اخلاق کو نہایت آسانی سے منوا لیتا ہے۔ باقی رہے اس ضابطہ کے ایسے گوشے جن کا تعلق بالا دست طبقے سے ہوتا ہے جن کے ہاتھ میں امور دنیا وی کا نظم و انصرام ہوتا ہے۔ تو وہ انہیں وعظ و نصیحت کرتا رہتا ہے کہ ظلم کرنا برا ہے۔ غریبوں کو ستانا اچھا نہیں۔

ہر حقدار کو اس کا حق دینا ضروری ہے۔ سائل کو رد نہیں کرنا چاہئے۔ محتاج کو دھتکارنا معیوب ہے۔ مذہب اس باب میں اتنا ہی ضروری سمجھتا ہے کہ بالا دست طبقہ کو اس قسم کے وعظ کہتے رہنا ضروری ہے۔ اس کا نام اس نے "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" رکھ دیا ہے۔ جب بالا دست طبقے کی طرف سے مفلوک الحال محتاجوں کی طرف کوئی بھیک کا ٹکڑا آپڑتا ہے تو مذہب ان کی شان میں قصیدے کہنے شروع کر دیتا ہے اور ان غریبوں اور محتاجوں کو جن کے حقوق کے غصب و نہب سے ان بالا دستوں کی شان و شوکت قائم ہوتی ہے "ھل جزاء الاحسان الا الاحسان" کے خود ساختہ پر فریب مفہوم سے عمر بھر دعائیں دینے اور ان غاصبین کا بے دام غلام بنے رہنے کی تلقین کرتا ہے۔

یہ ہے اس ضابطۂ اخلاق کی حقیقت جو مذہب کا عروۃ الوثقیٰ ہوتا ہے اور جسے وہ نہایت بلند آہنگ دعاوی کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ قرآن ساری دنیا کو چیلنج دیتا ہے کہ اس کے متعین کردہ نظام (دین) کے ضابطہ کی ایک شق کی مثل کوئی قانون مرتب کر کے دکھاؤ۔ اور دنیا ایسا قانون مرتب کر کے نہیں دکھا سکتی جس میں معاشی نظام حیات مستقل اقدار سماوی سے اس طرح ہم آہنگ ہو۔ اس لئے دین اپنے نظام میں بے مثل و بے نظیر ہوتا ہے۔ لیکن مذہب جس ضابطۂ اخلاق کو پیش کرتا ہے وہ دنیا کی ہر قوم میں مشترک ہوتا ہے۔ اس لئے کسی مذہب کا یہ دعوےٰ کہ وہ دوسرے مذہب پر فوقیت رکھتا ہے' بالبداہت باطل ہوتا ہے۔ لہٰذہ مختلف مذاہب نہایت آسانی سے آپس میں مفاہمت کر سکتے ہیں۔ مذہب کا ایک گوشہ اپنی گروہ بندی کو قائم رکھنے کے لئے دوسرے مذہب سے برسرِ پیکار رہنے میں ہی اپنی بقا کا راز مضمر دیکھتا ہے۔ اس لئے وہ اس ضابطۂ اخلاق سے قطع نظر کر کے اپنے رسوم و مناسک کے اصلح و انفع ہونے پر مناظرے اور مباحثے کرتا رہتا ہے۔ لیکن مذہب کا دوسرا گوشہ جسے تصوف کہتے ہیں' ان رسوم و مناسک سے اعراض برت کر ضابطۂ اخلاق کے اشتراک پر آمادۂ مفاہمت ہو جاتا ہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ یہ مفاہمت ایسی یک رنگ ہو جاتی ہے کہ رامؔ اور رحیمؔ ایک ہی سکے کی دو طرفیں قرار پا جاتی ہیں۔ چونکہ تصوف یکسر تصورات پر مبنی ہوتا ہے اس لئے شاعری اسے خوب ہوا دیتی ہے۔ تصوف' شاعری کے لئے نہایت وسیع میدان پیدا کرتا ہے اور شاعری' تصوف کو حقیقت بنانے کے لئے "دلائل" بہم پہونچاتی ہے جن کی حقیقت محض تشبیہات سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ اس طرح یہ شاعری بے عمل قوم کے لئے زندگی کا پرسکون بہانہ بن جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ شاعری ان کے رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے اور وہ چارپائی پر بیٹھے لیٹے تصور ہی تصور میں زندگی کے مختلف مراحل و مدارج طے کرتی ہوئی چلی جاتی ہے۔

افکار میں سرمست' نہ خوابیدہ نہ بیدار۔

جب کبھی زندگی کا کوئی مسئلہ سامنے آتا ہے، اس کے لئے کسی شاعر کا برجستہ شعر پڑھ دیا جاتا ہے، اور اس کے بعد سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ مسئلہ حل ہو گیا۔

مذہب، اس سادہ لوح قوم کو اس طرح نظریات میں الجھائے رکھتا ہے اور ملوکیت کو کھلا چھوڑ دیتا ہے کہ وہ جسدِ انسانیت سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لے۔

جب قرآن کا لایا ہوا دین (یعنی نظامِ حیات) مذہب اور ملوکیت میں تبدیل کر دیا گیا تو وہ تمام جیتے جاگتے نتائج جو اس نظام کا فطری نتیجہ تھے، معدوم ہونے شروع ہو گئے۔ اس لئے کہ قرآن نے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ یہ نتائج، قانون کے ساتھ وابستہ ہیں، کسی قوم کے نام یا اس کی تراش خراش کے ساتھ نہیں۔ لہٰذا جب اس قوم نے، جو اس ضابطۂ حیات کی اصلیت پر یقین رکھتی تھی، اسے ضابطۂ زندگی ماننے سے عملاً انکار کر دیا تو کامرانیوں اور کامیابیوں کی راہیں اس قوم پر مسدود ہو گئیں۔ دیکھئے! قرآن نے اس حقیقت کو کیسے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے جب فرمایا کہ

کیف یھدی اللہ قوما کفروا بعد ایمانھم۔ بھلا خدا کا قانون اس قوم پر کس طرح عروج و ارتقاء کی راہیں کھول دے جو اس قانون کے درخشندہ نتائج پر ایمان لے آنے کے بعد پھر اس سے (عملاً) انکار کر دے۔

وشھدوا ان الرسول حق۔ درآنحالیکہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ اس نظامِ حیات پر عمل کرنے والے (رسول) کی جدوجہد نے کیسے تعمیری نتائج پیدا کئے تھے (حق)

وجاءھم البینات۔ اور اس طرح اس نظامِ زندگی کی واضح دلیلیں اس کے سامنے روشن ہو گئی تھیں۔

واللہ لا یھدی القوم الظالمین۔ اللہ کا قانون اس قوم پر عروج و ارتقاء کی راہیں کبھی نہیں کھولتا جو حقائق کو اپنی جگہ پر نہیں رہنے دیتی (ظلم)[*]

اولئک جزاءھم ان علیھم لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین (۳/۸۶-۸۷)۔ ان لوگوں کی اس روش کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان تمام نتائجِ حسنہ سے محروم رہ جاتے ہیں جو خدا کا قانون، اس قانون کو خلوص حقائق

---

[*] ظلم کے معنی ہیں وضع الشیئ فی غیر موضعہ المختص بہ (راغب) یعنی کسی شے کا اس مقام پر نہ رکھا جانا جو اس کے لئے مختص ہے۔ جب کسی نظام کے پرزے اپنی اپنی جگہ پر نہ رہنے دیئے جائیں تو اس سے اس کا توازن بگڑ جاتا ہے جس کا نام فساد یا سوء ہے جو حسن کی یا اصلاح کی ضد ہے۔ قرآن نے سورۂ نمل میں ظلم کو سوء سے تعبیر کر کے حسن کے مقابلہ میں رکھا ہے۔ دیکھئے (۲۷/۱۱)۔

میں تبدیل کرنے والی کائناتی قوتیں اور انسانوں کا اجتماعی نظام پیدا کرتا ہے۔

اِن آیات سے یونہی نہ گزر جایئے۔ یہ ایک عظیم الشان قانون کو بیان کرتی ہیں۔ "کفر بعد از ایمان" وہی ہے جس کے متعلق دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ الذین جعلوا القرآن عضین (۱۵/۹۱) "وہ لوگ جنہوں نے قرآن کے الگ الگ ٹکڑے کر دیئے"۔ اس نظامِ واحد کو دنیا اور آخرت کے الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر دیا۔ اور اس طرح ملوکیت اور مذہب وجود میں آئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لوگ دین کے نظام کے تمام ٹھوس نتائج سے محروم رہ گئے۔ ملوکیت اور مذہب دونوں دین ہی کے الگ الگ ٹکڑے ہیں لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ ان دونوں میں دین کی کوئی بات بھی باقی نہیں رہتی۔ پانی کی مثال پر پھر غور کیجئے۔ پانی کا فطری خاصہ ہے کہ وہ آگ بجھاتا ہے۔ لیکن اسی پانی کے اجزائے ترکیبی کو جب الگ الگ کر دیا جائے اور پانی کا قطرہ اس طرح ہائیڈروجن اور آکسیجن میں تبدیل ہو جائے تو ان اجزاء کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ہائیڈروجن خود جلتی ہے اور آکسیجن دوسری چیزوں کو جلنے کا سامان بہم پہونچاتی ہے (کوئی چیز آکسیجن کے بغیر جلتی نہیں)۔ یعنی پانی کے اجزائے ترکیبی میں سے کسی جز میں بھی پانی کی خاصیت (PROPERTY) باقی نہیں رہتی۔ اسی طرح دین جب الگ الگ ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے تو اس کے دونوں ٹکڑوں (حکومت اور مذہب) میں سے کسی میں بھی دین کی خصوصیات باقی نہیں رہتیں۔ بلکہ ان کی خصوصیات دین کی خصوصیات کی ضد ہوتی ہیں۔ دین، وحدت پیدا کرتے آیا تھا۔ ملوکیت اور مذہب نے ملت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، اور یہ قانونِ خداوندی سے اعراض برتنے کا فطری نتیجہ تھا (جسے عذاب کہا جاتا ہے)۔

قل ھو القادر علیٰ ان یبعث علیکم عذابًا من فوقکم او من تحت ارجلکم او یلبسکم شیعًا ویذیق بعضکم باس بعض۔ انظر کیف نصرف الآیات لعلھم یفقھون (۶/۶۵)

ان سے کہہ دو کہ خدا کا قانون اس پر قادر ہے کہ (اس کی خلاف ورزی کرنے سے) تم پر خارجی دنیا سے عذاب لے آئے یا داخلی دنیا (تمہارے پاؤں کے نیچے) سے۔ یا تم گروہوں میں بٹ کر خلط ملط ہو جاؤ (اور اس طرح تمہاری وحدت و انفرادیت ختم ہو جائے) اور تم ایک دوسرے کی شدتِ قوت کا شکار ہو جاؤ دیکھو: ہم کس طرح (تاریخی شہادات سے) ان حقائق کو بھیر بھیر کر تمہارے سامنے لاتے ہیں تاکہ تم ان پر غور و فکر کرو۔

اربابِ مذہب "نتائج" کو اعمال سے اتنا دور لے گئے کہ انہوں نے سب کچھ "آخرت" پر اٹھا رکھا۔ اس لئے ان کا دنیا میں کچھ حصہ نہ رہا۔ اہلِ حکومت نے اپنی تمام توجہات قہری مفاد (دنیا) پر ہی مرتکز کر دیں۔ اس لئے ان کا حال تو خوش گوار ہو گیا۔

لیکن مستقبل روشن نہ ہو سکا۔ اس لئے کچھ عرصہ کے بعد ان سے حکومت و سلطنت بھی چھن گئی۔ غور کیجئے۔ قرآن نے حال (دنیا) اور مستقبل (آخرت) کے اس فرق کو کس قدر نمایاں اور حال کے چند افتادہ مفادہی کو مقصود و منتہیٰ سمجھنے والوں کے مآل کو کیسے واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ سورۃ التوبہ میں ہے۔

یاایھا الذین اٰمنوا مالکم اذا قیل لکم انفروا فی سبیل اللہ اثاقلتم الی الارض۔ ارضیتم بالحیاۃ الدنیا من الاٰخرۃ۔ فما متاع الحیاۃ الدنیا فی الاٰخرۃ الا قلیل (۹/۳۸)

اے وہ جو ایمان کے دعوے دار ہو، تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ[1] میں قدم اٹھاؤ، تو تمہارے پاؤں بوجھل ہو کر زمین پکڑ لیتے ہیں۔ کیا تم مستقبل سے بے فکر ہو کر قریبی مفاد کے پیچھے پڑ گئے ہو؟ اگر ایسا ہی ہے تو (تم نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ) قریبی مفاد تو مستقبل کے مقابلہ میں کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔

اگر تم اس روش پر قائم رہے تو اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟

الا تنفروا یعذبکم عذابا الیما ویستبدل قوما غیرکم ولا تضروہ شیئا۔ واللہ علی کل شیئ قدیر (۹/۳۹)

اگر تم نے (مستقبل کی تابناکی کے لئے) قدم نہ اٹھایا تو یاد رکھو خدا کا قانون تمہیں اس کی بڑی دردناک سزا دے گا۔ یعنی تمہیں تمہاری جگہ وہ دوسری قوم کھڑے آئے گا اور تم (اس انحراف سے) خدا (کے قانون) کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے (خود ہی تباہ ہو گے)۔ اللہ کا قانون ہر عمل کو اس کے نتیجہ کے ساتھ موافق کر دیتا ہے۔ (قدر)

چنانچہ اس طرح، رفتہ رفتہ ان کی وسیع و عریض حکومتیں بھی ختم ہوتی گئیں سمٹ سمٹا کر چھوٹی چھوٹی جاگیرداریوں میں تبدیل ہو گئیں جن کی بقا آج دوسروں کے رحم و کرم پر ہے۔ جب تک اقوامِ مغرب کی سیاسی مصلحت کوششوں کا تقاضا ہو یہ جاگیرداریاں قائم رہیں گی۔ جب ان کے مصالح کا تقاضا ہو انہیں ختم کر دیا جا سکتا ہے۔ جوں جوں سلطنتیں مٹتی گئیں (یعنی امورِ دنیا دوسروں

---

[1] فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ) کے قرآنی مفہوم کے لئے آپ کو کچھ وقت اور انتظار کرنا ہو گا۔ سر دست اتنا سمجھ لیجئے کہ قرآن اس اصطلاح کو بالعموم اجتماعی نظام کے لئے استعمال کرتا ہے جس کی بنیادیں مستقل اقدار (وحی) پر ہوں۔

کے ہاتھوں میں چلے گئے، قوم زیادہ سے زیادہ مذہب پرست بنتی گئی۔ چنانچہ آج ساری دنیا کے مسلمانوں کی یہی حالت ہے، جہاں جہاں ان کی حکومتیں باقی ہیں، ملوکیت اپنی بدترین شکل میں موجود ہے۔ اور جہاں حکومتیں ختم ہو گئی ہیں وہاں مذہبیت اپنے جذام کو سمیٹے ہوئے ان پر مسلط ہے۔ حکومتیں آپس میں برسرپیکار ہیں اور مذہب پرست گروہ آپس میں نبرد آزما۔ ان کا تمام معاشرہ، علمی سرمایہ، ان کے تصورات حیات، ان کے نظریات زندگی، سب کے سب افسردگی کے پیغامبر وارثیا اور موت کے نقیب۔ تمدن، تصوف، شریعت، کلام، بتانِ عجم کے پجاری تمام

اور یہ اس لئے کہ :-

حقیقت، خرافات میں کھو گئی   یہ امت، روایات میں کھو گئی

قرآن نے مسلمانوں کو قدم قدم پر دعوتِ غور و فکر دی تھی۔ زمین و آسمان میں فکر، انفس و آفاق میں فکر، دنیا اور آخرت میں فکر۔

كذالك يبين الله لكم الآيات لعلكم تتفكرون ۝ في الدنيا والآخرة (۲/۲۱۹)

اس طرح اللہ اپنی نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم دنیا اور آخرت میں غور و فکر کرو۔

اس نے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اگر تم "عذاب النار" سے بچنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم ارض و سما میں غور و فکر کرو۔ اس غور و تدبر سے تم اس قانونِ خداوندی کا مطالعہ کر سکو گے جو کائنات کے رگ و پے میں جاری و ساری ہے، اور جب تم یہ معلوم کر لو گے کہ کائنات میں کونسا قانون نافذ العمل ہے جس سے یہ محیر العقول سلسلہ اس قدر متوازن و ہموار، اپنی ارتقائی منازل طے کرتا آگے بڑھے جا رہا ہے، تو تم پھر یہ بھی معلوم کر لو گے کہ تمہیں اپنی حیاتِ اجتماعیہ میں اس ہمہ گیر قانون کو کس طرح ایک موثر حقیقت بنانا ہے۔ یہی "اللہ کے ذکر" سے مفہوم ہے۔

ان في خلق السماوات والارض۔ واختلاف الليل والنهار۔ لآيات لاولي الالباب ۝
الذين يذكرون الله قياماً وقعوداً وعلى جنوبهم ويتفكرون في خلق السماوات
والارض۔ ربنا ما خلقت هذا باطلاً سبحانك فقنا عذاب النار (۳/۱۹۰-۱۹۱)

یہ ایک حقیقت ہے کہ ارض و سماوات کی تخلیق اور رات اور دن کی گردشوں میں ارباب دانش و بینش کے لئے ارتقا کی سیدھی راہوں کے نشانات ہیں۔ وہ ارباب دانش جن کی کیفیت یہ ہے کہ وہ کھڑے، بیٹھے، لیٹے، ہمیشہ ارض و سماوات کی تخلیق پر غور کرتے رہتے ہیں، اور اس انداز کے گہرے تدبر و تفکر

سکے بعد اس حقیقت کو اپنے سامنے مشہود دیکھ لیتے ہیں کہ اللہ کے نشو ونما دینے والے قانون نے کائنات
کو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ تخریبی پہلو تعمیری پہلوؤں پر غالب آجائے اور اس طرح اس دنیا کو جہنم بنا دیں
خدا کا تعمیری پروگرام ایسے تخریبی مآل سے کوسوں دور ہے۔

اس لئے یہ حقیقت بھی ان کے سامنے واضح کر دی تھی کہ جو لوگ غور و فکر سے کام لیتے ہیں وہ اگر تعداد میں تھوڑے بھی ہوں تو بھی ان لوگوں کی اکثریت پر غالب رہتے ہیں جو کچھ سوچ سے کام نہیں لیتے وان یکن منکم مائۃ یغلبوا الفا من الذین کفروا بانھم قوم لا یفقھون (۸/۶۵) "اگر تم میں سو آدمی بھی ایسے ہو گئے (جو سمجھ بوجھ سے کام لینے والے ہوں) تو وہ ہزار کافروں کو مغلوب کر کے رہیں گے۔ اس لئے کہ کافروں کا گروہ ایسا ہے جو سمجھ بوجھ سے کام نہیں لیتا" یہ ہے دنیا میں قوموں کی کامیابی کا راز۔ جب تک مسلمانوں کے سامنے قرآن کی یہ تعلیم رہی۔ انہوں نے اشیاء فطرت پر غور و فکر کرنا اور کائنات کی قوتوں کو اپنا تابع فرمان بنانا عین فریضۂ زندگی سمجھا لیکن جب مذہب کے تقلیدی مسلک نے ان کے قوائے فکریہ کو مفلوج کر دیا تو عقل و فکر سے کام لینا ان پر حرام ہو گیا۔ قرآن نے عالم کا لفظ، سائنٹسٹ[1] (SCIENTIST) کے لئے استعمال کیا تھا۔ سورۂ فاطر میں دیکھئے کس طرح یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ فرمایا۔

الم تر ان اللہ انزل من السماء ماء۔ کیا تم اس پر غور نہیں کرتے کہ اللہ کا قانون بادلوں سے پانی برساتا ہے؟

فاخرجنا بہ ثمرات مختلفا الوانھا۔ اور اس پانی (اور مٹی کے امتزاج) سے مختلف اقسام کے پھل پیدا کر دیتا ہے۔

---

[1] قرآن نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا ہے کہ علم کو اگر مستقل اقدار سماوی (وحی) سے ہم آہنگ نہ کیا جائے، تو اس کا نتیجہ تباہی و بربادی ہوتا ہے۔ سورۂ مومن میں ان اقوام سابقہ کے متعلق جو قوتوں اور ثروتوں کی مالک تھیں، فرمایا کہ فلما جاءتھم رسلھم بالبینات فرحوا بما عندھم من العلم "جب ان کے پاس ہمارے فرستادہ واضح دلائل لیکر گئے تو انہوں نے یہ کہہ کر (منہ پھیر لیا) کہ جو کچھ ہمیں ہمارے علم نے دے رکھا ہے ہم اس پر مطمئن ہیں"۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وحاق بھم ما کانوا بہ یستھزءون (۴۰/۸۳) "ان کو ان تباہیوں نے آن دبوچا جنہیں وہ ایک استحقار آمیز ہنسی سے ٹال دیا کرتے تھے" لہٰذا دین کا تقاضا یہ ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے مستقل اقدار سماوی (وحی) کے مطابق ان کا استعمال کیا جائے۔

ومن الجبال جدد بیض وحمر مختلف الوانھا وغرابیب سود۔ اور پہاڑوں میں سرخ و سپید مختلف رنگوں کے خطے ہیں۔ اور بعض ان میں سے رنگ موٹی کی سی) سیاہی مائل ہوتے ہیں۔

ومن الناس والدواب والانعام مختلف الوانہ۔ اور (نباتات و جمادات کی دنیا سے آگے بڑھیے تو) انسانوں اور حیوانوں کی دنیا میں غور کیجئے کہ یہ کس قدر انواع و اقسام کی دنیا ہے۔

کذالک انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء۔ یہ کائنات اسی طرح پھیلی ہوئی ہے سو جو لوگ اس پر غور و فکر کے بعد اس کے متعلق علم حاصل کر لیتے ہیں' وہی قانونِ خداوندی کی عظمت و کبریائی کا صحیح احساس کر سکتے ہیں۔

غور کیجئے۔ یہاں علماء کا لفظ استعمال ہی ان کے لئے ہوا ہے جو کائنات کے مختلف شعبوں پر غور و فکر کرتے ہیں (اسی کو سائنس کہتے ہیں) لہٰذا اس کا ترجمہ ہی سائنٹسٹ ہے۔ لیکن جب 'دین' مذہب سے بدل گیا تو علماء کے معنی لائبریرین کے رہ گئے۔ آپ شاید حیران ہوں گے کہ میں نے مذہبی علماء کو لائبریرین کس طرح سے کہہ دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے ہاں سب سے بڑا عالم کون ہوتا ہے۔ وہ جو یہ بتا سکے کہ فلاں مسئلہ کے متعلق، بخاری میں کیا لکھا ہے۔ فتح الباری نے اس کی تفسیر کیا بیان کی ہے۔ علامہ آلوسی کا اس باب میں کیا ارشاد ہے۔ درمختار میں اس کی بابت حواشی سعدیہ، بدایع اور درایت کیا منقول ہے۔ صاحب ہدایہ نے ذخیرہ سے کیا نقل کیا ہے۔ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں کیا ارشاد فرمایا ہے۔ علامہ شامی نے شیخ ابن ہمام سے کیا نقل کیا ہے۔ جو سب سے زیادہ حوالے دے سکے وہی سب سے بڑا "مفتیٔ دین" اور "حامل شرع متین" ہوتا ہے۔ یہ لائبریرین کا کام نہیں تو اور کیا ہے؟ چونکہ مذہب کی دنیا میں کسی معاملہ میں اپنی رائے کو دخل دینا سب سے بڑا جرم ہے۔ اس لئے سب سے زیادہ صحیح جواب وہ ہوگا جس میں کہیں عقل کی بو نہ آنے پائے۔ اور یہ مسائل جن کے لئے ان ذخائر کتب کی اوراق گردانی و سطور شماری ہوتی ہے' ہوتے کس قسم کے ہیں؟ ایک عزیز دوست گزشتہ حج کے لئے عازم ہوئے تو میں نے ان سے خاص طور پر کہا کہ وہ وہاں مختلف ممالک کے علماء سے ملیں اور دیکھیں کہ وہ کن مسائل و مباحث پر گفتگو کرتے ہیں۔ واپسی پر میں نے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ وہ کم و بیش تمام علمائے مکہ و مدینہ اور دیگر ممالک اسلامیہ سے مل کر آئے ہیں۔ جن مسائل پر سب سے زیادہ گفتگو رہی وہ یہ تھے کہ جمع بین الصلوتین بالمقصر فی عرفۃ والمزدلفہ (عرفہ اور مزدلفہ میں نمازوں میں قصر یا جمع) جائز ہے یا نہیں؟ قبروں میں نماز پڑھی جا سکتی ہے یا نہیں۔ سب سے زیادہ مرکزِ توجہ یہ مسئلہ عظیم تھا کہ لاؤڈ اسپیکر پر نماز پڑھائی جا سکتی ہے یا نہیں۔ شیخ عبدالعزیز ابو ... (امام حرم) اور شیخ عبداللہ بن السبیل (امام حرم) اور شیخ عبدالرزاق مدیر مدرسہ دار الحدیث مکہ مکرمہ اور مولانا شیخ عبدالرزاق العفیفی الازہری جیسے "علمائے کبار" سب کے سب اسی اہم

مسئلہ پر بحث کرتے تھے۔ داڑھیوں کے متعلق بھی گفتگو تھی اور میز پر کھانا کھانے کے متعلق بھی۔ اس لئے کہ جب "امورِ دنیا" کو دنیا داروں کے سپرد کر دیا جائے تو اہل مذہب کے لئے اور کون سے مسائل رہ جاتے ہیں جن پر گفتگو کی جا سکے۔ ان "علماء" میں ایک گروہ ان کا بھی ہے جو اپنے آپ کو غیر مقلد کہتا ہے۔ اس سے ناواقف لوگوں کو شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ شاید عقل و فکر سے کام لینے کے مدعی ہوں گے۔ لیکن یہ شبہ ناواقفیت کی بنا پر ہے۔ مقلد اور غیر مقلد، فرقہ بندی کی اصطلاحیں ہیں۔ عقل و فکر سے دونوں کو کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ مقلد' ائمہ فقہ کی تقلید کرتے ہیں اور غیر مقلد' روایات کی تقلید۔ تقلید کی تائید میں ان کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ ہم رسول اللہؐ یا صحابہ کبارؓ یا ائمہ فقہؒ کی اتباع کرتے ہیں۔ یہ کہتے وقت اتنا نہیں سوچتے کہ رسول اللہؐ، صحابہ کبارؓ اور ائمہ فقہؒ تو کسی کے مقلد نہیں تھے۔ وہ تو مسائل زندگی کا حل خود سوچتے تھے۔ لہٰذہ ان کی اتباع تو یہ ہے کہ آپ بھی اپنے مسائل زندگی کا حل اس طرح سے خود سوچئے جس طرح وہ خود سوچا کرتے تھے۔

غور کیجئے کہ جس قوم کی یہ حالت ہو کہ ہزار برس سے اس نے سوچنا ترک کر رکھا ہو' کیا اس قوم میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت بھی باقی رہ سکتی ہے؟ تقلید کا اثر کس قدر غیر مرئی بلکہ غیر محسوس اور کس درجہ گہرا اور تحت الشعور میں جاگزیں ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ مختلف مثالوں سے لگ سکتا ہے۔ ایک مسلمان کا بچہ گوشت کی طرف لپک کر جائیگا لیکن وہی گوشت ایک چینی کے لڑکے کے سامنے لائیے' اُسے اس سے جھرجھری آجائے گی اور اس کی طبیعت متلانے لگے گی۔ اس کی طبیعت کا ایسا ردعمل کسی منطقی فیصلہ کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ اس میں عقل و شعور کو دخل ہی نہیں ہوتا۔ طبیعت کا یہ ردعمل یکسر غیر شعوری ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک مسلمان کو دیکھئے۔ قرآن نے جن چار چیزوں کو بہ نص صریح حرام قرار دیا ہے ان میں ایک وما اھل بہ لغیر اللّٰہ (۲/۱۷۳) بھی ہے۔ یعنی ہر وہ شے جسے اللہ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کیا جائے۔ ہمارے ہاں پیروں اور اولیاؤں کی نیازیں روز دی جاتی ہیں۔ غیر اللہ کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے ان کی حرمت بہ نص صریح ثابت ہے لیکن چونکہ ہمارے گھروں میں ان کا عام رواج ہے' اس لئے ان نیازوں کو چھوٹے بڑے سب کھاتے ہیں اور طبیعت پر اس کا کوئی ناخوشگوار اثر نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس' جھٹکا چونکہ کھایا نہیں جاتا' وہ اگر کھاتے وقت سامنے سے گزر جائے' یا اس کا ذکر تک بھی کر دیا تو متلی ہونے لگ جاتی ہے۔ حتکہ اگر کسی کے شراب کے پیالے میں چوہیا گر جائے تو اس کے نزدیک وہ شراب بھی "حرام" ہو جاتی ہے۔ اور وہ اسے اٹھا پھینکتا ہے۔ یہ سب کچھ غیر شعوری طور پر ہوتا ہے۔ اور اس باب میں آپ کا ذہن کبھی اس طرف آنے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا کہ اس کے متعلق آپ کی طبیعت کا ردعمل' سوچ سمجھ کا نتیجہ ہونا چاہیئے۔

انہی مثالوں سے اس حقیقت پر غور کیجئے کہ جب ایک قوم اپنے آبا و اجداد کے مسلک پر تقلیداً چلی جا رہی ہو تو واقعات و حوادث کے متعلق ان کا ردِعمل کسی غور و تدبر کا نتیجہ نہیں ہو سکتا بلکہ ان کا ردِعمل یکسر غیر شعوری ہوتا ہے جس بات کو غیر شعوری طور پر مستحسن مانتے چلے آ رہے ہیں وہ مستحسن نظر آتی ہے اور جسے غیر شعوری طور پر مذموم سمجھتے چلے آ رہے ہیں وہ مذموم ہوتی ہے۔ نہ اسے مستحسن سمجھنے کے لئے ان کے پاس کوئی واقعی دلیل ہوتی ہے نہ اسے مذموم سمجھنے کے لئے کوئی حقیقی برہان۔ مناظروں اور مباحثوں کے تقاضوں سے مجبور ہو کر انہیں اپنے مسلک کی "حقانیت" کے لئے دلائل تراشنے پڑتے ہیں۔ لیکن مناظرہ ہمیشہ فریقین کی ذاتی قابلیتوں کا مقابلہ ہوتا ہے۔ ہر فریق اس "ایمان" کے ساتھ سامنے آتا ہے کہ اس کا مسلک عین حق و صداقت کا مسلک ہے اور فریقِ مقابل کا مسلک غوایت و ضلالت کی روش۔ اس "ایمان" کے بعد ذاتی قابلیتوں کا تقابل ہوتا ہے۔

مذہب پرست مسلمان کی یہ کیفیت ہزار برس سے ہو رہی ہے۔ سوچئے کہ ان حالات میں فکرِ نو کا، کہ جس پر قوموں کی زندگی کا انحصار ہے کہیں امکان بھی ہو سکتا ہے؟

معنیٔ تازہ کہ جوئیم و نیابیم کجاست
مسجد و مکتب و مے خانہ عقیم اند ہمہ

صدیوں کی تقلید سے انسانی ذہن، مساجد کے حجروں اور خانقاہوں کی طرح تاریک ہو چکے ہیں جن میں عقل کی روشنی کی کوئی شعاع کہیں سے بار نہیں پا سکتی۔ مسلمان کی آج حالت یہ ہے کہ

پست فکر و دوں نہاد و کور ذوق
مکتب و ملائے او محروم شوق

جب کسی قوم کا ذہن، اس طرح تاریکیوں میں گھرا ہوا ہو تو عروج و ارتقا کی راہیں اسے نظر کس طرح آ سکتی ہیں؟ کظلمات فی بحر لجی یغشہ موج من فوقہ موج من فوقہ سحاب ظلمات بعضہا فوق بعض۔ اذا اخرج یدہ لم یکد یراھا۔ ومن لم یجعل اللہ لہ نورًا فما لہ من نور (۲۴/۴۰) جیسے سمندر کی گہرائیوں میں تاریکیوں کی لہر پہ لہر چڑھتی آ رہی ہو (داخلی دنیا کی تاریکیوں کا یہ عالم اور خارجی دنیا کی یہ کیفیت کہ) آسمان پر گھنگھور گھٹا چھا رہی ہو۔ اندھیرا ہے کہ اندھیرے کے اوپر چڑھتا جا رہا ہے۔ ایسا اندھیرا کہ اپنا ہاتھ باہر نکالے تو وہ بھی دکھائی نہ دے (یعنی دوسروں کا صحیح مقام متعین کرنا تو ایک طرف، خود اپنا مقام بھی دکھائی نہ دے) دکھائی کیسے دے؟ دکھائی تو دینا تھا دین کی روشنی سے۔ جب دینِ خداوندی ہی روشنی نہ دے تو روشنی کہاں سے ملے؟ "مذہب" خود تاریکی ہے۔ تاریکی سے تاریکی ہی ملے گی۔ روشنی کیسے مل سکتی ہے؟

یہ ہے حالت آج مسلمان کی۔ اس کی دنیا، ملوکیت کی لعنت میں گرفتار ہے۔ بادشاہتیں، سرمایہ داریاں، جاگیرداریاں، زمینداریاں، غرضیکہ معاشی زندگی کی تمام ناہمواریاں (جسے قرآن نے فساد فی الارض کہہ کر پکارا ہے) سب اسی لعنت کبیرہ کے مظاہر ہیں۔

اور اس کی "آخرت" مذہب کی تاریکیوں میں چھپی ہوئی، شریعت کے رسوم و مروجات، علم کلام کے نظری مباحث، تصوف کی فسوں کاریاں، سب انہی تاریکیوں کے پیدا کردہ چھلاوے ہیں۔ اور ان کے اندر جکڑا ہوا بیچارہ مسلمان، للچائی ہوئی نظروں سے دوسری قوموں کو دیکھتا ہے اور کچھ سمجھ نہیں سکتا کہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے؟

آں کہ گوید لا الٰہ بیچارہ ایست　　فکرش از بے مرکزی آوارہ ایست

چار مرگ اندر پے ایں دیر میر　　سود خوار و والی و ملا و پیر

اس ذہنی اور جسمانی استکراہ و استبداد کے بعد سینہ میں روشنی کی کرن کہاں سے آسکتی ہے؟

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری　　اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

یہ ہیں اسباب زوال امت۔ "اسباب" محض تفصیل کے اعتبار سے۔ ورنہ درحقیقت سبب صرف ایک ہے اور وہ ہے مذہب۔ دنیا میں آج تک کسی مذہب پرست قوم نے ترقی نہیں کی۔ نظر دوڑا کر دیکھئے۔ یہ حقیقت ہر طرف بکھری ہوئی دکھائی دے گی۔ جس قدر کوئی قوم زیادہ مذہب پرست ہے اسی قدر وہ دنیاوی ترقیوں میں پست و زبوں حال ہے تبت کے لاموں کے پیرو اور چین کے بدھ مت کے متبع پورے کے پورے مذہب میں ڈوبے ہوتے ہیں، ان کی حالت ظاہر ہے۔ جن قوموں میں ایک طبقہ مذہب پرست ہوتا ہے اور دوسرا دنیا دار، ان کا مذہب پرست گروہ دنیا دار طبقہ سے پست حالت میں ہوتا ہے۔ ہندوستان میں سناتن دھرمی فرقہ کبھی آگے نہیں بڑھ سکا۔ خود یورپ میں عیسائی خانقاہوں کے مذہب پرست گروہ ہمیشہ پیچھے رہے۔ دنیا کے تھپیڑے رفتہ رفتہ اب کر دیتے ہیں کہ مذہب پرست طبقہ کے افراد وہاں سے کٹ کٹ کر دنیا داروں کی طرف آجاتے ہیں، اس طرح آہستہ آہستہ اس قوم کی اکثریت "دنیا داروں" کی ہو جاتی ہے اور مذہب عبادت گاہوں کی چار دیواری میں سمٹ کر رہ جاتا ہے۔ جیسے آج کل یورپ میں عام طور پر ہو رہا ہے۔ جب یہ تھپیڑے اور شدت اختیار کر لیتے ہیں تو مذہب کو یکسر خارج البلد کر دیا جاتا ہے، اور پوری کی پوری قوم خالص "دنیا دار" ہو جاتی ہے۔ جیسے (کہتے ہیں کہ) روس میں ہوا ہے (یا کم از کم مارکس کے فلسفہ کا دعویٰ ہے)۔ یہی حالت مسلمانوں کی ہے۔ ان کی اکثریت مذہب پرست ہے اس لئے پست و زبوں حال۔ جو کچھ مذہب نے دوسری جگہ کیا ہے وہی کچھ ان کے ساتھ ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ دیکھئے اس حقیقت کبریٰ کو قرآن کریم

نے کیسے واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کا یہ پیغام نوعِ انسانی کے لئے یکسر ہدایت و رحمت ہے لیکن

یضل بہ کثیرًا و یھدی بہ کثیرًا (۲/۲۶)

اسی قرآن سے بہت سے لوگوں کو ہدایت ملے گی اور بہت سوں کے حصہ میں گمراہی آئے گی۔

اس آیت جلیلہ پر غور کیجئے۔ خدا کہتا ہے کہ اسی قرآن سے بہت سے لوگوں کے حصہ میں گمراہی آئے گی۔ یہی پانی زندگی کی اساس بھی بنے گا، اور اس میں ڈوب کر انسان موت سے ہمکنار بھی ہوگا۔ یہ کون ہیں جن کے حصہ میں اسی قرآن سے بربادی اور تباہی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ وہ کہتا ہے کہ وما یضل بہ الا الفاسقین۔ گمراہی فاسقین کے حصہ میں آئے گی۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ فاسقین کون ہیں؟ وہ کہتا ہے الذین ینقضون عھد اللہ من بعد میثاقہ۔ وہ لوگ جنہوں نے قانونِ فطرت (سنۃ اللہ) کے مطابق نظامِ حیات قائم کرنے کا عہد کیا لیکن اس کے بعد اس عہد کو توڑ دیا۔ اس کی مزید وضاحت ان الفاظ سے فرما دی کہ ویقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل۔ ہاں! یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس چیز کے ٹکڑے کر دیئے جسے ملا کر رکھنے کا حکم خدا نے دیا تھا۔ خدا کے قانون نے یہ بتایا تھا کہ حیات ایک غیر منقطع وحدت ہے۔ طول میں بھی اور عرض میں بھی۔ طول میں دنیا اور آخرت، حال اور مستقبل میں کوئی حد فاصل نہیں۔ یہاں سے وہاں تک ایک مسلسل جوئے رواں چلی جاتی ہے۔ اس لئے دنیا اور آخرت کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے ان کے لئے الگ الگ ضوابطِ زندگی تجویز کرنا فسق ہے۔ شرک ہے۔ اسی طرح عرض کی طرف وحدتِ انسانیت کے بجائے، انسانوں کو افراد، شعوب، قبائل، اقوام میں تقسیم کر کے حد بندیاں قائم کر دینا بھی اس وحدت کا قطع کر دینا ہے اور یہ فسق ہے۔ اس فسق و شرک کا عملی نتیجہ یہ ہوگا کہ زندگی میں ناہمواریاں پیدا ہو جائیں گی (یفسدون فی الارض)۔ اور ایسی قوم کا انجام یہ ہوگا کہ وہ سخت نامراد و ناکام رہے گی۔ (اولئک ھم الخاسرون ۲/۲۷)

آپ نے غور کیا کہ قرآن نے ان مختصر سی آیات میں کتنے اہم، اساسی قانونِ زندگی کی طرف اشارہ کیا ہے وہ کہتا ہے کہ دین کا نظامِ حیات کی وحدت کو عملاً قائم رکھنے کے لئے آیا تھا۔ یہ وہ نظام تھا جس کا نتیجہ اصلاح فی الارض (معاشی زندگی میں ہمواریاں) اور حسن مآب (مستقبل کی خوش گواریاں) تھا۔ اسی کا نام قرآن کی اصطلاح میں ہدایت ہے۔ اس کے بعد قرآن کی حامل قوم نے اس وحدت کے ٹکڑے کر دیئے اور اس کے ساتھ ہی قرآن کے بھی ٹکڑے کر دیئے۔ ایک حصہ کو دنیا سے متعلق سمجھ کر حقوق العباد قرار دے لیا۔ اور دوسرے حصہ کو آخرت سے چپکا کر حقوق اللہ نام رکھ لیا۔ اس کا نتیجہ فساد فی الارض (حال کی تباہی) اور خسران فی الآخرت (مستقبل کی بربادی) تھا۔

اس کا نام قرآن کی اصطلاح میں ضلالت ہے۔ قرآن وہی تھا۔ لیکن اب وہ سرچشمۂ ہدایت ہونے کے بجائے موجبِ ضلالت بن گیا۔ دین میں قرآن ضابطۂ حیات تھا۔ مذہب میں پہونچ کر قرآن مُردوں کو ثواب پہونچانے کا ذریعہ بن گیا یضل بہ کثیرًا و یھدی بہ کثیرًا۔ ہزار برس سے یہ قوم بظاہر قرآن کو سینے سے لگائے پھر رہی ہے لیکن اس قرآن سے انہیں سوائے ضلالت اور خسران کے اور کچھ نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ کائنات کا قانون یہ ہے کہ ہر شے اپنے اصلی مقام پر ہی اپنے مضمر فوائد سے تمتع کر سکتی ہے۔ اسے اس کے صحیح مقام سے ہٹا دیجئے، وہی شے ضرر انگیز ہو جائیگی پانی کو کشتی کے نیچے رکھئے تو وہی پانی کشتی کی روانی کا ذریعہ ہوگا۔ اسے کشتی کے اوپر لے آئیے، وہی پانی سیلاب بلا بن کر کشتی کو لے ڈوبے گا۔ کسی شے کو اس کے صحیح مقام سے ہٹا دینا، قرآن کی اصطلاح میں ظلم کہلاتا ہے۔ اس لئے قرآن نے بتا دیا کہ ظالمین کے لئے اس میں ناکامی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں و ننزل من القرآن ما ھو شفاء و رحمۃ للمؤمنین "اور ہم نے قرآن میں جو کچھ نازل کیا ہے وہ ایمان والوں کے لئے شفا و رحمت ہے۔" ولا یزید الظالمین الا خسارا (۱۷/۸۲) لیکن جو اسے اس کے صحیح مقام سے ہٹا دیں گے ان کے لئے اس میں خسارہ کے سوا کچھ نہیں" مسلمان کے کاروبارِ زندگی میں جو چیز گھاٹے کا موجب بن رہی ہے وہ قرآن ہے جسے اس کے صحیح مقام سے ہٹا دیا گیا ہے۔ قرآن جب اپنے حقیقی مقام پر تھا تو دین کہلاتا تھا اور جب اس مقام سے ہٹ گیا تو اس کا نام مذہب ہو گیا۔ قرآن وہی ہے، اس کا مقام بدل گیا ہے۔

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم — جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر!
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز — تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو "ناخوب" بتدریج وہی "خوب" ہوا — کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اسبابِ زوال آپ کے سامنے آگئے۔ اور اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اس زوال کو عروج سے بدلنے کی راہیں کون سی ہیں۔ بات صاف ہے اگرچہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات مسلمانوں کی سمجھ میں شاید ہی آسکے۔

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے — ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

بات صرف اتنی ہے کہ مسلمانوں کو مذہب چھوڑنا ہوگا۔ مذہب چھوڑنے کے بعد ان کے سامنے دو راستے ہوں گے۔ یا تو یہ بھی دنیا کی قوموں کی طرح اپنا مقصود و مدعا فقط قریبی مفاد (دنیا) قرار دے لیں۔ اس کے حصول میں پھر کوئی جھجک (SCRUPLES) ان کے عناں گیر نہیں ہوگی۔ اس کے بعد جو حشر اقوامِ عالم کا ہوگا وہی ان کا ہو جائے گا۔

موت تو آ جائے گی لیکن وہ اس قسم کے تپ دق اور جذام کی سسکیوں سے تو اچھی ہوگی۔ اور دوسرا راستہ یہ کہ مذہب کو چھوڑ کر دین کو اختیار کر لیا جائے۔ اس میں قومی مفاد بھی اس انداز کے ہوں گے کہ دنیا کی دوسری قومیں اس پر رشک کریں گی اور اس کے مستقبل بھی ایسا روشن اور تابناک ہوگا کہ واشرقت الارض بنور ربھا (زمین اپنے نشوونما دینے والے خدا کے نور سے چمک اٹھی) کا درخشندہ منظر سامنے آ جائے گا۔ قرآن نے اس دین کے نظام کو متشکل ہوئی صورت (CRYSTALLISED FORM) کو نظامِ صلوٰۃ کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ صلوٰۃ کے اس مفہوم کو سامنے رکھ کر اب سورۂ مریم کی ان آیات کو پڑھئے جن میں پہلے اس ہدایت یافتہ اور منعم علیہ گروہ کا ذکر ہے جسے دین کے نظام نے علو مراتب عطا کیا تھا (ورفعنٰہ مکانا علیا) اور اس کے بعد فرمایا ہے۔

فخلف من بعدھم خلف اضاعوا الصلوٰۃ واتبعوا الشھوات فسوف یلقون غیا۔ (۱۹/۵۹)

پھر اس گروہ کے بعد ان کے جانشین ایسے پیدا ہوگئے جنہوں نے نظامِ صلوٰۃ کو ضائع کر دیا یعنی وہ اپنی پسندیدگیوں کے پیچھے پڑ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہلاکت ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

غور کیجئے۔ قرآن نے ہماری حالت کا کس قدر صحیح نقشہ کھینچ کر سامنے رکھ دیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ کیا جس قوم نے نظامِ صلوٰۃ کو ضائع کر دیا وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی یا اس کی بعث بعد الموت (اس موت کے بعد دوبارہ زندگی نشاۃ زندگی) کا بھی امکان ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر اس قوم میں صلاحیت کی ہر استعداد کچھ ختم نہیں ہوگئی تو اس کی نشاۃ ثانیہ کا امکان ہے۔ اس لئے کہ اس نظام کا ضابطہ اپنی محفوظ شکل میں دنیا میں موجود ہے۔ اس باز آفرینی کی صورت یہ ہے کہ جہاں سے صحیح شاہراہِ زندگی (صراطِ مستقیم) چھوڑ کر ایک غلط راستہ اختیار کر لیا تھا انہی قدموں پر واپس لوٹ کر پھر اسی مقام پر آ جایئے۔ (اسے توبہ کہتے ہیں)۔

الا من تاب وعمل صالحا فاولئک یدخلون الجنۃ ولا یظلمون شیئا (۱۹/۶۰)

لیکن (اس کے بعد بھی) جو قوم پھر پیچھے پاؤں لوٹ جائے اور اصل راستہ پر پہنچ کر پھر وہ نظامِ عمل

۱؎ مذہب میں یہی نظامِ صلوٰۃ "نماز" پڑھنے میں تبدیل ہوگیا جس کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آتا۔ دین کے نظام کا صحیح عکس نظامِ صلوٰۃ میں جھلک جھلک کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ نظام کیا ہے اور اس میں کس طرح دین کا نظام منعکس ہو جاتا ہے۔ اس کی تفصیل کے لئے معارف القرآن کی آٹھویں جلد کا مطالعہ فرمایئے۔

اختیار کرلے جس کا نتیجہ زندگی کی ہمواریاں (عملِ صالح) ہیں - تو یہ قوم پھر اپنی فردوسِ گمگشتہ پالے گی اور پھر ان کی کوششیں اپنا پورا پورا نتیجہ پیدا کرنے لگ جائیں گی

کون سی فردوسِ گمگشتہ؟

جنات عدن التی وعد الرحمان عبادہ بالغیب - انہ کان وعدہ ماتیا (۱۹/۶۱)

وہ ہمیشہ رہنے والی جنت (جس کی بہار میں خزاں نہیں اور) جس کا وعدہ خدائے رحمان نے اپنے ان بندوں سے کر رکھا ہے جو اس کے قانون کے مطابق کوششوں کے ان دیکھے نتائج پر ایمان رکھتے ہیں. یقیناً اس کا وعدہ (قانون کا نتیجہ) ایسا ہے جیسے ایک بات وقوع میں آگئی -

ہاں! وہ جنّت

لا یسمعون فیھا لغوا الا سلاما - (۱۹/۶۲)

جس میں بے معنی باتوں (کی شاعری)[1] نہیں ہوگی - ہر بات ایسی ہوگی جو کمیوں (DBFICIENCIES) کو پورا کرکے انسانیت کو تکمیل تک پہونچا دے[2]

ایسا نظام جس میں

ولھم رزقھم فیھا بکرۃ وعشیا - (۱۹/۶۲)

ان کے لئے ہمیشہ کھلا رزق ہوگا (اس میں کسی کے لئے کمی نہیں ہوگی) -

یہ ہے وہ جنت جو ارضی زندگی کو آسمانی مستقل اقدار کے ساتھ ہم آہنگ کرنے (تقویٰ) کا فطری نتیجہ (وراثت) ہوگی -

تلک الجنۃ التی نورث من عبادنا من کان تقیا (۱۹/۶۳)

یہ ہے وہ جنت جو ہم اپنے بندوں میں سے انہیں عطا کریں گے جو تقویٰ شعار ہوں گے -

لہٰذہ قرآن کی رو سے اس نظامِ دین کے قیام کا امکان ہر وقت ہے جس کا فطری نتیجہ اس قسم کی جنت ہے جس میں ہر فرد کو اس کی فطری صلاحیتوں کے نشوونما پانے اور بار آور ہونے کے پورے پورے اور یکساں مواقع میسر ہوں گے -

---

[1] لغو: چڑیوں اور پرندوں کی بے معنی بولیوں کو کہتے ہیں -

[2] سلم کے معنی یہ ہیں کہ تمام کمیوں اور کمزوریوں کو پورا کرکے کسی شے کو اس کی (FULL EST DEVELOP MENT) عطا کر دی جائے - یہی اسلام کا مقصود ہے -

یہ ہیں وہ دو راہیں جو مذہب کو چھوڑ کر اختیار کی جا سکتی ہیں۔ اگر مسلمان مزید ذلت و خواری سے بچنا چاہتا ہے تو اسے بہرحال مذہب چھوڑنا ہوگا اور اس کے بعد یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ اسے خالص دنیا (قریبی مفاد) کی راہ اختیار کرنی ہے یا حال و مستقبل دونوں کی درخشندگی کی دینی راہ۔ اس وقت ان کی یہ حالت ہے کہ اکثریت اپنی موجودہ پستی و زبوں حالی میں مگن ہے۔ وہ اپنی افیون کی پینک سے باہر آنا ہی نہیں چاہتی۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جنہیں اقوامِ عالم کی دیکھا دیکھی اس پستی سے نکلنے کا احساس پیدا ہو رہا ہے۔ لیکن چونکہ صحیح راہ ان کے بھی سامنے نہیں اس لئے وہ مذہب کے اثرات سے باہر نہیں نکل سکتے۔ ان کی کوشش یہ ہے کہ امورِ دنیا کے ساتھ کچھ اخلاقی اقدار اور کچھ مسلمانوں کے سابقہ ادوارِ حکومت کے تعزیری قوانین، اس طرح شامل کر لئے جائیں کہ ہماری حکومتیں، اسلامی حکومتیں بن جائیں۔ چنانچہ ان کے سامنے "اسلامی حکومتوں" کا معیار، ہارون الرشید اور مامون الرشید کے زمانہ کا بچھڑ کیلا تمدن ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اس قسم کی پیوند سازی سے یہ نظام کبھی دینی نظام نہیں بن سکتا۔ ہائیڈروجن اور آکسیجن کو ایک بوتل میں بند کر دینے سے پانی نہیں بن جایا کرتا۔ اس امتزاج کے لئے ایک کیمیاوی عمل کی ضرورت ہے۔ اس عمل کیمیاوی کے بغیر ایک ظاہری "اتحاد" تو پیدا ہو جاتا ہے، حقیقی ائتلاف[1] کہ جس کا نتیجہ ان عناصر کے طبعی خصائص میں یکسر قلب ماہیت پیدا کر کے انہیں ایک نئے عنصر میں تبدیل کر دینا ہوتا ہے، کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کے ظاہری اور خارجی پیوند کا نتیجہ الٹا خسران ہوتا ہے۔ قرآن، کفرِ خالص کو بھی نتیجہ خیز بتاتا ہے (اس کے سامنے قریبی مفاد ہوتے ہیں اور وہ مفاد اسے حاصل ہو جاتے ہیں) اور دینِ خالص کو بھی نتیجہ خیز (جس میں حال اور مستقبل دونوں روشن ہو جاتے ہیں) لیکن وہ "کفر اور دین" کی اس قسم کی امتزاجی کوشش کو نیم صداقت یعنی منافقت قرار دیتا ہے جس میں کوئی کوشش بھی بار آور نہیں ہوتی۔ سورۂ بقرہ کی اس آیت کو ایک مرتبہ پھر سامنے لائیے جو اس سے پیشتر درج کی جا چکی ہے۔ بات واضح ہو جائیگی

افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض۔ فما جزاء من یفعل ذالک منکم
الا خزی فی الحیاۃ الدنیا ویوم القیامۃ یردون الی اشد العذاب (۲/۸۵)

کیا تم ایسی روشِ زندگی اختیار کر رہے ہو کہ جس میں قانون کی بعض شقوں کو اختیار کر لو اور اس کے دوسرے حصوں کو الگ رکھ دو۔ یاد رکھو! جو قوم بھی اس قسم کی روش اختیار کرے گی اس کی اس کوشش کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہوگا کہ اسے حال کی زندگی میں بھی ذلت و رسوائی نصیب

---

[1] قرآن اتحاد میں ائتلاف کا تقاضا کرتا ہے (الف بین قلوبکم)۔

ہوگی اور اس کے بعد بھی سخت ترین سزا ملے گی۔

قرآن دین کے نظام کو خالصۃً اختیار کرنے کی تاکید کرتا ہے: "شتر مرغی" انداز سے نہیں۔ فاعبد واللہ مخلصین لہ الدین (۳۹/۲)۔

یہ ہے میرے نزدیک صحیح راہِ عمل۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے بہت کم لوگ اس کا صحیح مفہوم سمجھ سکیں گے۔ اور جو اسے سمجھ سکیں گے ان میں سے بھی بہت کم ایسے ہوں گے جو اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے اپنے اندر آمادگی پائیں گے۔ نہ سمجھ سکنا اس لئے کہ مذہب نے اپنے اعتقادات و رسوم کو اس قدر مقدس بنا رکھا ہوتا ہے کہ انسان اس کے خلاف ایک لفظ تک سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ کسی ملحد سے باتیں کیجئے تو وہ کم از کم عقلی دلائل تو سنے گا، لیکن مذہب پرست گروہ عقل کو پاس نہیں پھٹکنے دے گا۔ اور جو کچھ اس کے پاس تقلیدی وراثت سے پہونچ چکا ہے، اسے کسی کسوٹی پر پرکھنے کے لئے قطعاً تیار نہیں ہوگا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

افمن زین لہ سوء عملہ فراٰہ حسناً فان اللہ یضل من یشاء و یھدی من یشاء (۳۵/۸)

جس کا برا عمل اس کے لئے خوش گوار بن جائے اور اسے نہایت حسین دکھائی دے، کیا وہ بھی کبھی سیدھے راستہ پر آسکتا ہے؟ یہ ہے وہ قانونِ مشیت جس کے مطابق گمراہی اور ہدایت کا فیصلہ ہوتا ہے

جو غلط بات کو غلط سمجھے اس کے راہِ راست پر آجانے کی توقع ہوتی ہے لیکن جو اسے سمجھے ہی بالکل صحیح تو وہ اسے کس طرح چھوڑ سکتا ہے؟ اسی لئے رسول اللہؐ سے ارشاد ہوا کہ فلا تذھب نفسک علیھم حسرات (۳۵/۸) "سو جن لوگوں کی یہ کیفیت ہو چکی ہو انہیں راہِ راست پر لانے کی فکر میں تو اپنی جان کو کیوں ہلاک کرتا ہے"؟

اور سمجھ جانے کے بعد عمل کرنا اس لئے دشوار ہوتا ہے کہ اس راہ میں ایسے ایسے معبود (انداداً من دون اللہ) کھڑے ہوتے ہیں جن کا خود اپنے ہاتھوں سے توڑنا کسی خلیل اکبری کا کام ہو سکتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ مذہب کی راہ ایسی تن آسانی کی راہ ہوتی ہے کہ اسے چھوڑ کر دین کی پیہم سعی و عمل کی راہ اختیار کرنا لوہے کے چنے چبانا ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے کہ دین کی مخالفت ہمیشہ مترفین (تن آسان لوگوں) کی طرف سے ہوتی ہے۔ مجھے ان تمام باتوں کا احساس ہے۔ لیکن بایں ہمہ مجھے میری قرآنی بصیرت نے جس نقطہ تک پہونچایا ہے میں نے کاغذ پر محفوظ کر دینا ضروری سمجھا ہے کہ آج نہیں تو آنے والی نسلوں میں شاید کوئی اس سے مستفید ہو سکے۔ اگر اس وقت کوئی قرآن پر

غور کرنے والا اسی راستے پر چل نکلا تو اسے میرے پاؤں کے نشانات دیکھ کر کم از کم اتنا اطمینان تو ہوگا کہ اس راہ سے اس سے پہلے کوئی اور بھی گزرا ہے۔

اور اگر میرے مخاطبین میں ایسے ارباب فکر و نظر موجود ہیں جو میرے ان نتائج فکر قرآنی سے متفق ہیں، تو مجھے اس سے بڑی مسرت ہوگی، اگر وہ مجھے اس سے مطلع فرمائیں، کیونکہ دنیا میں جو رشتہ قرآنی فکر و نظر کی ہم آہنگی و یک جہتی سے پیدا ہوتا ہے اس سے زیادہ محکم و استوار رشتہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے اس ربط باہمی سے ہم اس مسئلہ پر مزید غور و فکر سے راستہ کی دشواریوں میں آسانیاں پیدا کر سکیں اور اس طرح قرآنی بصیرت کی شمع عالمتاب سے ان پردوں کو اُٹھا سکیں جو ہزار برس کی تقلیدی تاریکیوں اور مذہبی ظلمتوں سے اس پر پڑے ہوئے ہیں (لیخرج الذین آمنوا وعملوا الصالحات من الظلمات الی النور) میرا ایمان ہے (اور میرے تجربہ نے اس ایمان کو مشہود کر کے دکھا دیا ہے) کہ جب تک ہم خالص قرآن کو اپنے سامنے نہیں رکھتے، دین کا نظام ہماری سمجھ میں نہیں آتا، ہم کبھی وہ انقلاب پیدا نہیں کر سکتے جو قرآن نے ایک مرتبہ پیدا کیا تھا اور جسے ہر وقت پیدا کرنے کی قوت وہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہی وہ انقلاب ہے جو قرآن کی حامل قوم کے ذریعے ساری انسانیت میں ایک انقلاب پیدا کر دے گا، وہ انقلاب جس میں دنیا یہ حقیقت عملاً سامنے دیکھ لے گی کہ

کس نباشد در جہاں محتاج کس   نکتۂ شرع مبین این است و بس

کچھ اپنے متعلق

ماہوار رسائل عام طور پر اپنے سالنامے شائع کرتے ہیں۔ طلوع اسلام نے کبھی اس روشِ عامہ کا تتبع نہیں کیا۔ زیر نظر پرچہ میں چونکہ محترم پرویز صاحب کا گراں قدر مقالہ "اسباب زوال امت" شائع ہو رہا تھا۔ مقالہ کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ اسے ایک ہی قسط میں شائع کیا جائے۔ لیکن اس سے، دیگر مسائل و مباحث کے ساتھ رسالہ کی ضخامت بہت بڑھ گئی اس واسطے یہ شمارہ سالنامہ قرار پا سکتا تھا۔ لیکن ہم نے اسے جنوری اور فروری کا مشترکہ پرچہ قرار دے لیا ہے۔ اب آیندہ پرچہ مارچ کا شائع ہوگا۔

(۲) اس پرچہ سے طلوع اسلام کے سائز میں تبدیلی کر دی گئی ہے۔ یہ تبدیلی احباب کے تقاضے کے پیش نظر کی گئی ہے امید ہے اسے عام طور پر پسند کیا جائے گا۔

(۳) دسمبر میں اعلان کیا گیا تھا کہ جنوری کا پرچہ صرف ان ہی حضرات کو بھیجا جائے گا جن کا چندہ وصول ہو چکا ہوگا۔ لیکن یہ پرچہ ان حضرات کو بھی بھیجا جا رہا ہے جن کے چندے ابھی تک وصول نہیں ہوئے۔ اس لئے کہ اس پرچہ میں "اسباب زوال امت" کا مضمون ایسا اہم ہے جس سے ہم قارئین طلوع اسلام میں سے کسی کو بھی محروم نہیں رکھنا چاہتے جن حضرات کا چندہ فروری کے آخر تک وصول نہ ہوا ان کے نام پرچہ جاری نہیں رکھا جائے گا۔ اگر آپ نے ابھی تک چندہ نہیں بھیجا تو جلدی کیجئے

(۴) ترسیل چندہ بھیجنے کی بہترین شکل بذریعہ کراس چیک یا پوسٹل آرڈر ہے۔ اگر اس میں دقت ہو تو پھر بذریعہ منی آرڈر بھیج دیجئے۔ لیکن ہر حالت میں دفتر کی طرف سے مطبوعہ رسید ہی کو رسید ترسیل چندہ کی اطلاع تصور کیجئے۔ اگر یہ رسید نہ پہنچے تو دفتر سے دریافت کیجئے۔ یہ نہایت ضروری ہے کیونکہ ڈاک کا انتظام ابھی تک تسلی بخش نہیں۔

(۵) طلوع اسلام ضرورت سے زائد تعداد میں نہیں چھپوایا جاتا۔ اس لئے اگر آپ کا سلسلہ خریداری منقطع ہو گیا تو پھر درمیانی عرصہ کے پرچے آپ کو نہیں مل سکیں گے اس کا خیال رکھئے۔

(۶) جن حضرات کی طرف سے "معراج انسانیت" کی قیمت وصول ہو گئی تھی۔ انہیں کتاب بھیجی جا چکی ہے۔ اگر آپ نے قیمت بھیجی تھی لیکن کتاب ابھی تک نہیں ملی تو اس کے متعلق فوراً اطلاع دیجئے۔ تاکید ہے۔

(۷) معارف القرآن کے مکمل سیٹ کے لیے فرمائشیں توقع سے زیادہ آرہی ہیں۔ اگر آپ کے پاس مکمل سیٹ نہیں تو آپ جلدی منگا لیجیے - اگر کتاب باقی نہ رہی تو اس کے دوسرے ایڈیشن کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ کب شائع ہو سکے گا۔ کیونکہ اس کے بعد ادارہ کے سامنے پانچویں جلد کی اشاعت کا سوال آجائے گا۔

"معارف القرآن" جلد اول کی قیمت ۱۰ دس روپے - جلد دوم کی ۱۰ دس روپے۔ جلد سوم کی پندرہ روپے اور جلد چہارم کی بیس روپے ہے

مکمل سیٹ بذریعہ ریل گاڑی منگائیے۔ قیمت بذریعہ چیک ارسال فرمائیے۔

(۸) حساب فہمی میں کہیں غلطی ہو جائے تو گھبرا نہ جائیے - آپ کے اور ہمارے درمیان نہ معلوم کتنی کڑیاں اور شریک ہیں۔ کیا خبر غلطی کہاں واقع ہوئی ہے۔ پہلے معاملہ کی صفائی کے متعلق لکھئے - یہ نہایت ضروری ہے۔

عارف

ناظم ادارہ طلوع اسلام - رابسن روڈ - کراچی

اسلامی انقلاب پیدا کرنے کیلئے

صحیح لٹریچر کی ضرورت ہے

اور صحیح لٹریچر شائع نہیں ہو سکتا جب تک کوئی ادارہ اس مقصد کو اپنا خاص مشن نہ قرار دے لے۔ اس مقصدِ عظیم کے لئے :-

کتاب لمیٹیڈ

کے نام سے ادارہ نشر و اشاعت قائم کیا گیا ہے۔ جو اسلامی انقلاب پیدا کرنے والا لٹریچر شائع کرے گا۔ علامہ پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری جیسے قرآنی مفکرین کی تصنیفات شائع کرنے کا فخر اسی ادارہ کو حاصل ہوگا کتاب لمیٹیڈ کے ایک حصہ کی قیمت ایک ہزار روپیہ ہے۔ جسے قسطوں میں بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی قانون کے مطابق تجارتی اصولوں کے ماتحت یہ لمیٹیڈ ادارہ تمام بچت کا روپیہ ہر سال اپنے حصہ داروں میں برابر تقسیم کر دیا کرے گا۔ جس کی نظیر شاید ہی کہیں ملے۔ تفصیل کے لئے خط لکھیں :-

ملت کا خادم

جے۔ بی۔ عارف

منیجنگ ڈائیرکٹر کتاب لمیٹیڈ۔ رابسن روڈ۔ کراچی

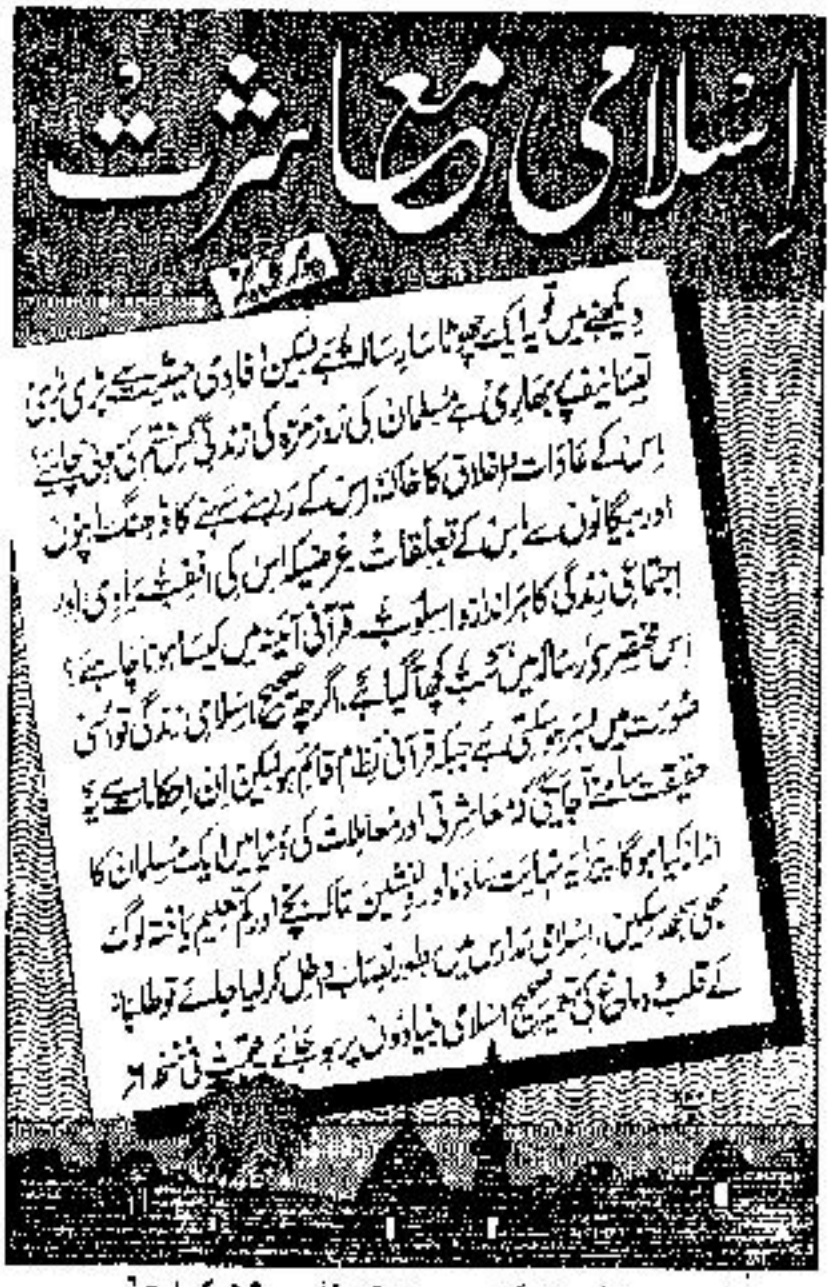

ادارہ طلوع اسلام رابسن روڈ کراچی

نوٹ :- سات آنے کے ٹکٹ بھیجکر کتاب طلب فرمائیں

Regd. No. S. 1089

Patronize Home Industries & Make Pakistan Self Sufficient

WE PRODUCE (& REGULARLY SUPPLY VARIOUS —WASHING SOAPS TO PAKISTAN MARKET—

"Four-Flags" Coco
"Cocodee" Coconut Oil
Refined "B"
"Pakistan" Brand Coconut Oil
Cottonseed Oil
Rapeseed Oil
Mustard Oil

"Four-Flags" Washing Soap
"Moonlight" Soap
Three Soap
(Cakes and Bars)
"Bengal" Soap
"Liaqat" Soap
Water Soap

SUBSIDIARY PRODUCTS

MUSTARDSEED CAKES, COTTONSEED CAKES & RAPESEED CAKES.

High Class TOILET & WASHING SOAPS Cakes & Bars.

Bengal Oil Mills Ltd.

provides for

Both

Internal & External Cleanliness By Producing

Highly Vitaminised & Nutritine Cooking Oil

High Class Washing Soap which Cleanses Clothes 'Milky White'

BENGAL OIL MILLS LTD.

Pakistan's Premier Oil & Soap Mills

(Inaugurated by QUAID-E-AZAM)

Telegrams "BENGALI" | P. O. BOX No. 162 KARACHI-2 | Telephone: Office : 3336, Mills : 200

Printed at Abbasi Litho Art Press, Ferer Road, Karachi and published by J. B. ARIF (Printer & Publisher) and issued from Pakistan Publishing House, Robeson Road, Karachi.